جنور کا شعر و ادب

علیم صبا نویدی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا انتخاب

مرتب

ڈاکٹر محمد علی اثر

نام کتاب — جنوب کا شعروادب

تعداد — ۵۰۰

قیمت — 60 روپئے

891.43929 Ali

نام مرتب — ڈاکٹر محمد علی اثر

پتہ — 9/226-4-20 ۔ چوک ۔ حیدرآباد 500002

مصنف — علیم صبا نویدی

پتہ — 26 امیرالنساء بیگم اسٹریٹ ۔ مونٹ روڈ ۔ مدراس 2

طابع وناشر — ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز ۔ مدراس 2

سنِ اشاعت — جون 1993ء م 1413ھ

سرِورق — قیصر سرمست" حیدرآباد

ملنے کے پتے

۱۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ — دہلی، بمبئی، علیگڈھ۔

۲۔ شب خون کتاب گھر — رانی منڈی الٰہ آباد ۔ (یوپی)

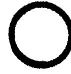
۳۔ مکتبۂ کہسار — برہ پورہ، بھاگلپور ۔ بہار۔

۴۔ مکتبۂ نوازن — نیا پورہ، مالیگاؤں (ناسک)

۵۔ ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز — 26 امیرالنساء بیگم اسٹریٹ ۔ مونٹ روڈ ۔ مدراس 2

۶۔ اسٹار پبلی کیشنز — آصف علی روڈ ۔ نئی دلّی 2

فہرست



مقدمہ

علیم صبا نویدی اردو کے اُن معدودے چند قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں، جن کی تخلیقی صلاحیتیں محض ایک دو اصنافِ ادب تک محدود نہیں۔ ایک طرف جدید شاعر کی حیثیت سے انہوں نے مختلف اصنافِ شعر جیسے غزل، آزاد غزل، ہائیکو، سانیٹ، نعت گوئی وغیرہ میں، اربابِ نقد و نظر سے اپنی ایک منفرد اور نمایاں حیثیت منوائی ہے۔ جس کے ثبوت کے طور پر اُن کی شاعری کے تعلق سے تحریر کئے ہوئے وہ مضامین کے مجموعے ہیں جو اردو کے ممتاز نقادوں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر نجم الہدیٰ، جناب کاظم نائطی، ڈاکٹر اختر بستوی اور راقم الحروف نے مرتب کئے ہیں۔ علیم صبا کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا دوسرا نمایاں پہلو نثر نگاری کے میدان میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے "شگاف در شگاف" اور "اُجلی مسکراہٹ" بہت پہلے ہی

شائع ہو کر اہلِ اردو سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی ترتیب و تدوین سے متعلق کتابوں میں "آزاد غزل شناخت کی حدوں میں"، "قید شکن"، "ثبوت"، اور "تذکرۂ شعراءِ تامل ناڈو" کے نام لائقِ ذکر ہیں۔

ادھر کچھ عرصہ سے علیم صبا نویدی کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین اردو کے موقر علمی و ادبی رسائل میں شائع ہو رہے ہیں۔ اور اب انھیں مضامین کو "جنوب کا شعر و ادب" کے عنوان سے کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پیشِ نظر کتاب چودہ مضامین پر مشتمل ہے۔ جن میں ابتدائی تین مضامین "شہرِ مدراس میں اردو نثر کا ارتقاء"، "تامل ناڈو میں اردو افسانہ" اور "تامل زبان کے جدید افسانہ نگار" تامل ناڈو کے نثری کارناموں سے متعلق ہیں۔ تاریخ ادب اردو پر سرسری نگاہ ڈالنے سے اس بات کا اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ ابتداء ہی سے شاعری کی بہ نسبت نثر نگاری کی جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شعرا کے مقابلے میں نثر نگاروں کی تعداد نسبتاً کم رہی ہے۔ لیکن یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے شائع ہونے والے رسائل اور کتابوں میں مختلف اصنافِ نثر کو خصوصیت کے ساتھ موضوع بنایا جا رہا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ علیم صبا نویدی نے تامل ناڈو جیسے دور افتادہ علاقے میں رہتے ہوئے بھی جنوبی ہند میں اردو نثر کی نشو و نما کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ پہلے مضمون میں شہر مدراس میں اردو نثر کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے علیم صبا نویدی مطلع کرتے ہیں کہ اس سرزمین میں اردو کے تحریری آثار کی ابتدا "ذخیرہ" اور "درالاسرار" کے مصنف اور صاحبِ دیوان شاعر شاہ سلطان سے ہوتی ہے۔ پھر سید شاہ عبدالقادر (میراں شاہ ولی اللہ) شیخ محمد مخدوم عبدالحق ساوی اور شاہ ابوالحسن قربی کے رسائلِ تصوف سے لے کر ڈاکٹر عبدالحق (مصنف انشائے حق)

تک کے نثری کارناموں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے، جنگِ آزادی کے بعد سرزمینِ مدراس میں اُبھرنے والے چھتیس ۳۶ قلم کاروں کے نثری کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مختصر سے جائزہ میں علیم صبا نے مدراس میں اردو کے ارتقا اور نثر نگاری کے میدان میں یہاں کے فن کاروں کی علمی و ادبی کاوشوں کو پردہ خفا سے باہر نکالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن علیم صبا صاحب نے تامل ناڈو کے قدیم نثر نگاروں کی جو فہرست دی ہے اس میں "ریاضِ غوثیہ"، "ریاضِ مسعود" اور "ضیاقت نامہ" کے مصنف غوثی آرکاٹی[1] کا نام شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ (اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری، حیدرآباد) میں غوثی آرکاٹی کی ایک قلمی نثری تصنیف "تفسیرِ غوثی"[1] (مخطوطہ نمبر ۵۴۱، تفسیر) کے نام سے ملتی ہے۔ جس میں غوثی نے "پارہ عم" کی تفسیر قدیم اردو نثر میں لکھی ہے۔ اس کے علاوہ اگر علیم صبا نویدی صاحب اس مضمون میں جامعہ مدراس کے شعبۂ اردو میں ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالوں کو بھی شامل کر لیتے تو بہتر تھا۔ جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے، مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر نجم الہدیٰ، ڈاکٹر عابد صفی اور ڈاکٹر سجاد حسین کی نگرانی میں متعدد تحقیقی مقالے قلم بند کئے گئے ہیں جن میں سے درج ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔	اردو ناولوں میں ترقی پسندی	از ڈاکٹر حیات افتخار	(پی ایچ ڈی)
۲۔	اردو کی اخلاقی مثنویاں	از ڈاکٹر ملکہ خورشید	(")
۳۔	قاضی بدرالدولہ، حیات اور کارنامے	از ڈاکٹر سجاد حسین	(ایم فل)
۴۔	تمل ناڈو کی اردو صحافت	از ڈاکٹر عابد صفی	(")

---

[1] نصیر الدین ہاشمی: کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات: ص: ۳۸
غوثی آرکاٹی پر ناچیز کا ایک تفصیلی مضمون زیرِ ترتیب ہے۔ نویدی

۵۔ والاجاہی خاندان کے تین شاعر از ڈاکٹر پروین فاطمہ (ایم فل)

۶۔ پریم چند کے افسانوں میں طبقاتی کشمکش از احمد ندیم (ایم اے)

۷۔ نواب محمود حیات اور کارنامے از محمد عبید الرحمن (ایم فل)

ان کتابوں کے مصنفین بحیثیت نثر نگار بعض کے نام گنوانا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ قلم کار علیم صاحب کی نظر میں درخور اعتنا نہیں[1]

تحقیق میں کسی چیز کو حرف آخر کہا جا سکتا ہے اور نہ کبھی تحقیق کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ یہ کام آنے والے محققین کا ہے کہ وہ مختلف نثر نگاروں کی تحریری کاوشوں کا سراغ لگائیں اور انھیں اردو کے وسیع تر حلقے سے روشناس کروائیں۔

دوسرے مضمون میں تامل ناڈو میں اردو افسانے کے آغاز اور ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے علیم صبا نویدی، نے لکھا ہے کہ تامل ناڈو میں شاعری کے مقابلے میں افسانے کی صنف کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اسی لیے اس سرزمین سے کوئی عظیم المرتبت افسانہ نگار منظر عام پر نہیں آیا۔ لیکن یہاں کے حالات اور ماحول کے پیش نظر جتنے بھی اور جیسے بھی افسانے نگار یہاں سے ابھرے ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون میں علیم صبا نے تامل ناڈو کے سترہ فن کاروں کی افسانہ نگاری کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ جس سے اُن کی ژرف نگاہی اور مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے دو باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ علیم صبا نویدی اگر پہلے مضمون کا عنوان "تامل ناڈو میں اردو نثر" قرار دیتے ہوئے تمام نثر نگاروں کا مفصل جائزہ لیتے تو یہ ایک جامع اور مبسوط مقالہ بن جاتا۔ موجودہ صورت میں اس مضمون (تامل ناڈو میں اردو افسانہ) میں درج ذیل افسانہ نگاروں کے نام شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

---

[1] میرے نزدیک بعض نثر نگار اور انکی تحریریں مشتبہ ہیں۔ ع۔ص۔ن

نورس خیامی، انور ربانی، عبدالعزیز عادل، دوسرے یہ کہ غالبؔ
مضمون نگار ہونے کی حیثیت سے علیم صبا نے بحیثیت افسانہ نگار اپنے نام کی
شمولیت کو غیر ضروری سمجھا۔ حالاں کہ وہ تامل ناڈو کے ایک باکمال افسانہ نگار ہیں
اور ان کے افسانوں کے تین مجموعے "روشنی کے بھنور"، "شگاف در شگاف" اور
"اُجلی مسکراہٹ" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

تیسرا مضمون تامل زبان کے جدید افسانہ نگاروں کے اجمالی تذکرے
پر مبنی ہے۔ تامل زبان دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے اور اس کا ادبی
سرمایہ جتنا قدیم ہے اتنا ہی عظیم بھی ہے۔ اس مضمون میں علیم صبا نے تامل زبان
کے تیرہ جدید اور قدآور افسانہ نگاروں اور اُن کے فن کو اہلِ اردو سے متعارف
کروانے کی قابلِ قدر اور قابلِ تقلید کوشش کی ہے۔

دوسرے زمرے کے مضامین لطیفؔ آرکاٹی، نواب تجمل حسین خان
ایمانؔ، شاہ عبدالحیٔ احقرؔ اور مولانا فدویؔ باقوی سے متعلق ہیں۔ لطیفؔ آرکاٹی غالبؔ
کا ہم عصر اور غلام غوث خان اعظمؔ کے دور (1820ء-1855ء) کا ایک خوش گو شاعر تھا
علیم صبا نے اپنے مضمون میں لطیفؔ آرکاٹی کے کلام کی اندرونی شہادتوں کی مدد سے اس
کے واقعاتِ حیات کے بعض نئے گوشوں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ
لطیفؔ کے ہم عصر شاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے شمالی ہند کے بعض شعراء بہادر شاہ ظفرؔ
مرزا غالبؔ، حکیم مومن خان مومنؔ کی زمینوں میں لطیفؔ کی کہی ہوئی غزلوں کی نشان دہی
کی ہے اور متذکرہ شعرا کے کلام سے ایسے اہم مضمون اشعار بھی پیش کئے ہیں۔ جنھیں لطیفؔ
نے بھی اپنے کلام میں باندھا ہے۔ دوسرا مضمون جلالؔ لکھنوی کے شاگرد اور جنوبی ہند
کے علاقے میں دبستانِ لکھنؤ کی نمائندگی کرنے والے شاعر نواب تجمل حسین ایمانؔ گوپاموی
کے بارے میں ہے۔ اس مضمون میں علیم صبا نویدی نے ایمان کی زندگی کے واقعات اور

ان کی شاعری کی خصوصیات پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ اول الذکر مضمون کے مقابلے میں یہ مضمون نہایت مختصر ہے۔ اگر اس مضمون میں ایمان کے حالاتِ زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کا تفصیلاً جائزہ لیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ اس سلسلے کا تیسرا مضمون مولانا عبدالحئی احقر کی علمی، دینی اور ادبی خدمات کے بارے میں ہے۔ شاہ عبدالحئی احقر المعروف بہ واعظ بنگلوری (۱۲۳۴ھ م 1818ء 1882ء) اپنے وقت کے ممتاز عالمِ دین ہونے کے علاوہ ایک کثیر التصانیف ادیب اور شاعر بھی تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد سو سے اوپر بتائی جاتی ہے۔ اس مضمون کے آغاز میں علیم صبا صاحب نے جنوبی ہند میں عموماً اور میسور میں خصوصاً اردو کے عہد بہ عہد نشوونما پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے سلطنتِ خداداد کے قیام کے بعد عہدِ حیدری (1761ء-1782ء) عہدِ ٹیپو سلطان (1782ء-1799ء) سے لے کر چامراج اوڈیار کے دور (تخت نشینی 1868ء) تک کے اہلِ قلم حضرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا احقر بنگلوری کے واقعاتِ حیات اور ان کی دینی مذہبی اور علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ علیم صبا نویدی کا یہ مضمون نہایت جامع اور پُر از معلومات ہے۔

چوتھا مضمون "پروفیسر غلام حسین دلیل اور نظم کائنات" ہے، جس میں علیم صبا صاحب نے پروفیسر دلیل کے واقعاتِ حیات، شخصیت اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا مفصل جائزہ لیا ہے۔

اس سلسلہ کا پانچواں مضمون مولانا قدوسی باقوی کے بارے میں ہے مولانا قدوسی جنوبی ہند کی مشہور و معروف دینی اور علمی درس گاہ "باقیات الصالحات" سے فیض حاصل کیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ مولانا نے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی ایک نسل کی فنی اور فکری اعتبار سے آب یاری کی ہے۔ ان کی

تربیت یافتہ نسل نے علم وادب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اُن کی اہمیت روزافزوں بڑھتی ہی جائے گی۔ فدوی باقوی صاحب کی ادبی شخصیت کے مختلف گوشوں کو منوّر کرتے ہوئے علیم صبا نویدی نے لکھا ہے کہ مولانا فدوی نہ صرف ایک باکمال شاعر ہیں بلکہ نثر نگاری کے میدان میں بھی انھیں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ اگرچہ کہ انہوں نے شاعری کے کم وبیش تمام اصناف کو اپنی طبع کا موضوع بنایا ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی اُن کی شاعری کے جوہر صنفِ رُباعی میں کھلتے ہیں۔ مولانا فدوی نے افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے بھی اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ ایک طرف کچھ تو اُن سے فیض حاصل کرنے والوں نے حقِ شاگردی ادا کرنے میں تساہل سے کام لیا ہے اور دوسری طرف ہمارے نقادوں نے بھی مولانا کی ادبی شخصیت کو منظرِ عام پر لانے کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی۔

تیسرے زمرے کے مضامین، علیم صبا نویدی کے قلم بند کئے ہوئے ہیں۔ آندھرا کرناٹک، اور تامل ناڈو کے قلم کاروں کی کتابوں کے مقدموں یا تعارف ناموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا مضمون راہی فدائی کی کتاب "کڈپہ میں اردو" (مطبوعہ 1992ء) پر علیم صبا کا تحریر کیا ہوا "تعارف" ہے۔ جس میں علیم صاحب نے مولانا راہی کی شخصیت اور شاعری کا ان کے مخصوص دینی اور علمی پس منظر میں تجزیہ کرتے ہوئے ان کی تازہ نثری تصنیف "کڈپہ میں اردو" کو مولانا کا ایک اہم تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ قرار دیا ہے۔

اس قبیل کا دوسرا مضمون "صنفِ دوہا اور ساغر جیدی" دراصل ساغر جیدی کے مجموعے "ثبوت" (سـ ء) پر علیم صاحب کا تحریر کیا ہوا مقدمہ ہے اس مضمون میں صبا نویدی نے صنفِ دوہا کے آغاز اور اس کی نشوونما پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو اور تلگو کے باکمال شاعر ساغر جیدی کے دوہوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ علیم

لکھتے ہیں کہ ساغر جیدی کے دوہوں میں ہندی لفظیات کے بجائے فارسی اور عربی الفاظ کے امتزاج سے دوہوں کی صنف کو ایک نیا رنگ و آہنگ اور ایک نئی تب و تاب نظر آتی ہے۔

اس سلسلہ کا تیسرا مضمون ڈاکٹر راہی قریشی کے مجموعہ کلام "عکس کی ہجرت" کے بارے میں علیم صبا کے تاثرات پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر راہی کرناٹک کے ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ گلبرگہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے ایک سینئر استاد بھی ہیں۔ ڈاکٹر راہی کی شاعری کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے علیم صبا صاحب نے لکھا ہے کہ راہی قریشی کے کلام میں روایت کی پاس داری کے ساتھ ساتھ جدید لب و لہجہ کی کھنک انھیں اپنے معاصر شعراء میں ایک نمایاں اور منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر راہی اپنے کلام میں آئینہ اور چراغ کے الفاظ کے حسین استعمال سے معنیٰ کی ایک سے زاید سطحوں کو روشن کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

چوتھا مضمون میسور کے مشہور شاعر اکرام کاوش کے مجموعہ کلام "آبِ زر" کا تعارف نامہ ہے۔ اس میں نویدی صاحب میسور میں اردو ادب کی ابتدائی نشو و نما پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ سلطنتِ خداداد کے قیام سے پہلے بھی یہاں اردو میں تصنیف و تالیف کے کام کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے عبدالمومن اور شاہ صدرالدین کا تذکرہ کیا ہے اور پھر سلطنتِ خداداد کے عہد سے لے کر عہدِ حاضر تک کے شعراء اور ادیبوں کے کارناموں کے علاوہ میسور کے بعض علمی و ادبی اداروں کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے اکرام کاوش کی نظموں کا تجزیاتی جائزہ لیا ہے۔

پانچواں مضمون بنگلور کے مشہور ادیب و شاعر عبدالقادر ادیب سے متعلق ہے۔ اس مضمون میں بھی علیم صاحب نے عبدالقادر ادیب کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات کو ضبطِ تحریر میں لانے سے پہلے اردو کے اہم انشائیہ نگاروں کا تذکرہ کیا ہے اور

پھر ادیب کی شخصیت اور فن کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

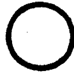
"جنوب کا شعر و ادب" کا آخری مضمون تامل ناڈو کے نامور ادیب یعقوب اسلم کے افسانوں کے مجموعہ "چہروں کی دیوار" (1980ء) کا پیشِ لفظ ہے۔ یعقوب اسلم تمل ناڈو کے افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں ان کی افسانہ نگاری کی فنّی جہتوں پہ علیم صبا نویدی نے بڑے سلیقے سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت اس بات کو منصۂ شہود پہ لاتی ہے کہ علیم صبا نویدی کے اشہبِ قلم نے شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اپنی جولانی دکھائی ہے۔ یہ امر بطورِ خاص داد کا مستحق ہے کہ انھوں نے جنوبی ہند کے نثر نگاروں اور شاعروں کو عموماً اور تمل ناڈو کے ادبی سرمایے کو خصوصاً منظرِ عام پہ لانے اور جدید قلم کاروں کو اردو دنیا سے متعارف کروانے کے اہم اور قابلِ قدر فریضہ کو بڑی ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا ہے۔

(دستخط)

ڈاکٹر محمد علی اثر

۶ جون ۱۹۹۳ء



شہرِ مدراس میں اردو نثر کا ارتقاء

شہرِ مدراس میں اردو نثر کا تقریباً تین سو سالہ طویل سفر مذہبی، علمی اورادبی رجحانات کا حامل رہا ہے۔ اس دَور کا علمی سرمایہ تصوّف کے نورانی پرتو کے زیرِ اثر تھا۔ سرزمینِ مدراس میں جن بزرگانِ دین نے اردو زبان و ادب میں تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے ابتداءً اُن کے پیشِ نظر زبان و ادب کی ترویج کی بجائے مذہب اور تصوّف کی نشر و اشاعت کا کام تھا اور وہ عوامی بول چال اور عام لوگوں کی زبان لے کر عوام الناس تک پہنچنا اور اپنی بات ان لوگوں تک پہنچا نا چاہتے تھے۔

شہرِ مدراس میں اردو نثر کی شروعات حضرت شاہ سلطان (ولادت ۱۶۰۹ء) کی تصانیف "درّ الاسرار" اور "زنجیرہ"[1] سے ہوتی ہے۔ آپ کے والد کا

[1] یہ دونوں کتابیں ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد میں موجود ہیں۔

سید فخرالدین سلطان حسینی تھا۔ حضرت شاہ سلطان سلسلۂ بندہ نواز کے بزرگوں میں سے ہیں۔ آپ کی مذکورہ دونوں کتابیں قدیم اردو میں تصوّف کے موضوع پر مرقوم ہیں[1]۔ اس کے بعد سید شاہ عبدالقادرؒ معروف بہ میراں شاہ ولی اللہ منزوی الجبلین (وفات 1146ھ م 1733ء) کی تصنیف "خلاصۃ الرویۃ"[2] ہے۔ اس کتاب میں تصوّف کے مسائل کی تشریح بہت سیدھی سادی اور عام فہم زبان میں ملتی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ حضرت شیخ محمد مخدوم عبدالحق ساوی عرف حضرت دستگیر صاحب (وفات 1165ھ م 1752ء) کا رسالۂ "مفتاح الکل" (جو تصوّف پر دکنی اردو میں ہے۔) حضرت سید شاہ ابوالحسن قربیؒ (وفات 1182ھ م 1769ء) کا "رسالۂ تصوّف"، حضرت باقر آگاہ (وفات 1220ھ م 1805ء) کی تصنیف "ریاض السیر" اور مختلف رسائل کے نثری دیباچے (جو زبان کے قواعد کی بحث پر مشتمل ہیں) حضرت مولانا مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر (وفات 1238ھ م 1822ء کی کتاب "ترجمۂ کیدانی"[3] حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری محویؔ (وفات 1243ھ م 1827ء) کا "رسالۂ تفصیل المراتب فی اطوار المراقب"[4] و دیگر رسائل تصوّف، قاضی بدرالدولہ محمد صبغۃ اللہ (وفات 1280ھ م 1863ء) کا "ریاض النسوان" و دیگر کتب دینیہ اور میر مہدی واصفؔ (وفات 1290ھ م 1873ء) کے مختلف النوع تصانیف اور تراجم سے ٹمل ناڈو میں اردو نثر کا تاریخی

---

[1] ٹمل ناڈو میں اردو نثر کا ارتقاء (غیر مطبوعہ) ڈاکٹر سید صفی اللہ

[2] اس کتاب کا نسخہ اورنٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مقام میں محفوظ ہے۔

[3] اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ محمدی میں موجود ہے۔

[4] کتب خانۂ لطیفیہ ویلور میں محفوظ ہے۔

سفر جس خوش گواری، شادابی اور بھرپور آب و تاب کے ساتھ جاری تھا وہ خالص دکنی پیرائے سے دکنی اردو کے پیرایۂ اظہار میں منتقل ہو کر حضرت سید شاہ عبدالغفار مسکینؔ (وفات 326 اھ م 908 اء) کی شرحِ "من لگن" (راز بحری)، حضرت محمد بدیع الدّین فاروقی (وفات 1959ء) مدیر "مؤرخ" مدراس کے مضامین اور تراجم، محمد اسماعیل سیٹھ مغمومؔ (وفات 348 اھ م 929 اء) کا سفر نامہ "ارمغانِ کلکتہ" اور دیگر مذہبی و دینی مضامین۔ حضرت نواب تجمّل حسین خان ایماؔن گوپاموی (وفات 354 اھ م 935 اء) کی تقریباً ایک درجن کتابیں منصہ شہود پر آچکی ہیں، سبھی کتابیں مذہبی موضوعات پر بڑی شگفتہ اور ٹکسالی زبان میں ہیں۔ ان تمام تصانیف میں موصوف کی معرکتہ الآرا، نادر اور نایاب تصنیف "پردہ" ہے۔ محمد منور خان گوہرؔ مدراسی (وفات 361 اھ م 1941ء) کا تاریخی اور تحقیقی کارنامہ "تذکرۂ شعرائے دکن" "سخنورانِ بلند فکر" (جلد اول مطبوعہ 1936ء اور جلد دوم مطبوعہ 1952ء) ٹمل ناڈو کی اردو نثر کی تاریخ کو ہمیشہ روشن کرتی رہیں گی۔

محمد منوّر خان گوہرؔ مدراسی کی متذکرہ تالیف نے جہاں شہرِ مدراس کے نثری ادب کو ایک نئے انقلابی اور ادبی ذائقہ سے آشنا کیا ہے وہیں مولانا رحیم احمد فاروقی (وفات 966 اء)، مولانا ابو بکر نظمی، مولانا ابوالجلال ندوی، علّامہ شاکر نائطی کے علمی، تحقیقی، تنقیدی بصیرت افروز مضامین اور ادبی تذکرے، ڈاکٹر عبدالحق کا سفر نامہ "اطالیہ" اور مجموعۂ مضامین "انشاءِ حق" اور شرر آلندوری اور مولانا حبیب خان سروش داؤدی کی علمی اور معلوماتی تحریروں نے مدراس میں اردو نثر کی فضا کو ایک گونہ رنگ و نور سے مزّین و آراستہ کیا ہے۔

جنگِ آزادی کے بعد شہرِ مدراس میں اردو نثر کا چلن اور بھی عام ہوا جس طرح نظم میں طبع آزمائی کی جاتی تھی اسی طرح نثری تخلیقات کی طباعت بھی

پُر زور طریقے پر ہوی۔ یہاں اس دور کے اہم اور ممتاز نثر نگاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے شہرِ مدراس ہی نہیں بلکہ سارے ٹمل ناڈو کے اردو کے جغرافیائی نقشے کو اپنی تمام تر ذہنی توانائیوں اور تابانیوں سے سیراب و شاداب کیا ہے۔

مولوی سید ابوالبرکات انور[1]

آپ ایک عرصہ تک روزنامہ "آزاد ہند" اور روزنامہ "مسلمان" میں صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ موصوف کے اکثر و بیشتر اداریے "نوائے وقت" لاہور کے کالم "مانگے کا اُجالا" کی زینت بنتے رہے۔ آپ کے سیاسی، علمی اور مذہبی تحریریں آج بھی "مسلمان" کے صفحات پہ محفوظ ہیں۔

سید سلطان محی الدین بہمنی[2]

موصوف روزنامہ "ہمدرد" مدراس کے مدیر تھے۔ تیر و نشتر کے تحت آپ کا لکھا ہوا حالاتِ حاضرہ پہ تبصرہ آپ کی خاص پہچان بن چکا ہے۔ آپ کی ادارت میں ایک دینی ماہ نامہ "امام" بھی منظرِ عام پہ آچکا ہے جس میں مذہبیات پہ موصوف نے بڑے جان دار مضامین لکھے ہیں۔

محمد یوسف کوکن عمری[3]

آپ کثیر التصانیف قلم کار ہیں۔ آپ نے متعدد انگریزی اور عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ آپ کی کتابوں میں امام ابنِ تیمیہ بہت ہی ضخیم اور متنازعہ فیہ کتاب ہے۔ موصوف کی تحریروں میں ایک طرح کا ثقل اور ایک گونہ خشکی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے قاری پر اس کا تاثر برائے نام ہی ہوپاتا ہے لیکن آپ کی تحریریں مواد اور معلومات کے لحاظ سے بہت جان دار اور وقیع ہوتی ہیں۔

---

[1] المتوفی 1976ء [2] 1966ء [3] المتوفی 1990ء

سید عظمت اللہ سرمدی[1]

آپ ایک صاحبِ اسلوب نثرنگار تھے۔ آپ کے علمی، ادبی، دینی موضوعات پر بہت سارے مضامین "مسلمان" مدراس "شاکر" مدراس کے علاوہ دینی رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔ آپ نے صحافت میں بھی کارہائے نمایاں انجام دئے آپ کو مختلف علوم سے واقفیت کے ساتھ اردو زبان و بیان پر خاص قدرت بھی حاصل تھی۔ مطالعہ وسیع ہونے کی وجہ سے آپ کی نثری تحریریں بڑی معلومات افزا ہوتی تھیں۔ آپ کے مضامین کی زبان تصنع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔

جنید خان سروش داؤدی[2]

آپ بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار تھے۔ آپ بھی ہفت روزہ "شاکر" مدراس میں بالالتزام کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے مضامین کو یکجا کرکے پروفیسر احتشام حسین سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ موصوف کی وفات کے بعد بھی ان کے ورثا میں کسی کو اس کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوی۔ واقعہ یہ ہے کہ شہر مدراس میں مزاح نگاری میں اس قدر بلند و بالا مقام کا حامل کوئی اور فنکار تاحال پیدا نہیں ہوا۔

عبد العزیز عادل

موصوف ہندی اور اردو کے شاعر، ڈرامہ نویس اور ناول نگار ہیں، آپ کی زبان شستہ اور شائستہ ہے۔ کئی نصابی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ "فنِ بلاغت" پر بھی آپ کی کتاب "سخن فہمی" ہفت روزہ "رفیق ملت" مدراس میں قسط وار شائع ہو چکی ہے۔ آپ نے ایک طویل ناول "دولت کی بھینٹ" بھی

[1] المتوفی 1978ء [2] المتوفی 1964ء

شدالخیری کے معاشرتی رنگ میں تھا، لیکن افسوس ہے کہ یہ ناول
طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔

لی خان حیدر ۱؎ موصوف کا تعلق خاندانِ والا جاہی سے تھا۔ آپ نے ڈاکٹر عبدالحق کرنولی
محمد فاروقی آزاد مرحوم سے بھر پور استفادہ کیا۔ مدراس کی شعری
بنائے رکھنے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ بحیثیتِ نثر نگار آپ
ی مضامین "فانوسِ خیال" ماہ نامہ "منزل"، "امام" اور ہفت روزہ
شائع ہو چکے ہیں۔ زبان میں سادگی اور رکھ رکھاؤ آپ کے اسلوب
خصوصیات ہیں۔

شا محبوب ۲؎ موصوف کا تعلق نوابانِ آرکاٹ سے ہے۔ آپ نے اس خاندان کی
دینی خدمات پر بڑے معلومات انگیز مضامین لکھے ہیں جو ٹمل ناڈو
بیں آپ کی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ آپ کی تحریروں کی زبان سادہ
۔ آفریں ہوتی ہے۔ آپ نے تحقیق اور تاریخ ادب کو زندگی بھر اپنا
یقین ہے کہ اس لہو کا ہر قطرہ موصوف کو ٹمل ناڈو کے ادبی
یشہ زندہ رکھے گا۔

رازی ۱؎ حضرت دانش فرازی مرحوم کا تعلق اگرچہ ضلع شمالی آرکاٹ سے تھا۔ لیکن موصوف
زین حصہ شہرِ مدراس کی ادبی فضا کی نذر رہا۔ آپ بنیادی طور پر

۱۹۷ء   ۲؎ المتوفی۔ ۱۹۸۱ء

ایک عہد آفریں شاعر تھے۔ آپ نے جو نثری تحریریں اردو ادب کو دی ہیں وہ آج بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ ٹمل ناڈو کے شعراء پر آپ کے تعارفی خاکے (رسالہ "فروغِ ادب" وانمباڑی میں) ہمارے آئندہ کے مؤرخ اور محقق کے لیے ایک انمول خزانے کا درجہ رکھتے ہیں۔ موصوف کے علمی، ادبی اور فکری روشن اُفق کے نیچے سانس لینے والوں میں متعدد شخصیات ہمارے درمیان موجود ہیں جو بظاہر موصوف کے نام سے خود کو منسوب کرنے سے گریز کرتی ہیں۔

کاوش بدری

حضرت کاوش بدری کا تعلق بھی ضلع شمالی آرکاٹ سے ہے لیکن موصوف کی ذہنی اور ادبی پرورش و پرداخت میں شہرِ مدراس کی فضا نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ آپ ٹمل ناڈو کے ممتاز شاعر، محقق اور نقاد ہیں۔ آپ کی نثری تحریریں طویل ہونے کے باوجود اپنے دامن میں "معلوماتِ جزویہ" اور "افاداتِ فیضیہ" کی مہک لیے ہوئی ہوتی ہیں۔ آپ نے ماہ نامہ "فن کار" اور "منزل" کے ذریعہ اردو ادب میں نہ صرف اپنی پہچان قائم کی بلکہ شہرِ مدراس کے شعرا اور ادباء کی تخلیقی کرنوں کو شمالی ہند کے فن کاروں کے ذہن تک پہنچانے کا وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس کو ٹمل ناڈو کی اردو ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

محی الدینؒ عارف

موصوف کی شخصیت اور آپ کا فن دونوں ٹمل ناڈو کی اردو دنیا میں

الملہ المتوفی 1967ء

محتاجِ تعارف نہیں ۔ یہ وہ زندہ دل فن کار ہے جس سے اردو کی تنقیدی دنیا کو بہت سے امکانات وابستہ تھے لیکن افسوس ہے کہ عین جوانی میں ملک الموت کی دعوت پر اس نے اردو دنیا کو آخری سلام کیا۔ ہنگامی مضامین لکھنے میں موصوف کو کمال حاصل تھا۔ کئی ایک تنقیدی مضامین "شعلہ و شبنم" دہلی میں شائع ہو چکے ہیں ۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ماہ نامہ " جلترنگ" کی ادارت سنبھالی اور کئی علمی اور ادبی ہنگامے برپا کیئے ۔ ٹمل ناڈو کے بعض رسائل کے پس منظر میں نیک نیتی سے ادارتی فرائض انجام دینے والی باغ و بہار شخصیت کا ایک نام عارف مدراسی بھی تھا۔

راز امتیاز

آپ ٹمل ناڈو کے ممتاز صحافی ، قد آور شاعر اور منفرد نثر نگار ہیں

آپ نے اردو ادب کو وہ سب کچھ دیا جو ایک حساس اور آفاق گیر قلم کار دے سکتا ہے ۔ آپ کی تحریروں میں متانت ، ذہانت اور وضعداری کے نقوش بدرجۂ اتم موجود ہیں ۔ آپ نے اردو ادب کے جس موضوع کو بھی چھوا ہے اس کا حق ہی ادا نہیں کیا بلکہ اس موضوع کو نورٌ علیٰ نور بنا دیا ہے ۔ افسانوی ادب بھی موصوف کی ذہنی وسعتوں سے بھر پور آشنا ہے ۔ آپ کی صحافتی خدمات کا اعتراف بھی ادبی اور سرکاری طور پر کیا جا چکا ہے ۔ " ہندوستانی اردو صحافت" پر آپ کا مضمون (روزنامہ " علمبردار" بنگلور ، مطبوعہ 1984ء) تا قیامت تاریخ اردو صحافت میں اپنے روشن خدوخال کے ساتھ یاد رہے گا ۔

ادیب[1] بھارتی اور فرید[2] کیفی

یہ وہ دو منفرد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے سب سے پہلے تجد

---

[1] المتوفی 1971ء [2] المتوفی 1979ء

اور نئے انداز کے افسانوں کی بُنیاد ٹمل ناڈو میں رکھی۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کے مختصر افسانوں کا دَور اس شان و شوکت سے شروع ہوا کہ اُن کے پیچھے راقم الحروف کے علاوہ بہت سے نوجوان افسانہ نگاروں نے بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کے جوہر دکھائے اور مختصر افسانہ نگاری کے مدار میں آج بھی جلوہ فشاں ہیں۔ ادیب اور فرحت دونوں کے افسانے ہفت روزہ "فلم دلیش" مدراس، پندرہ روزہ "روپ" مدراس اور ماہ نامہ "پاکیزہ" مدراس میں شائع ہو چکے ہیں۔ ادیب بھارتی کا ایک افسانوی مجموعہ 967 اءمیں کتابت کی منزل سے گزر چکا تھا۔ نہ جانے کن وجوہات کی بناء پر وہ طباعت کا منہ نہ دیکھ سکا۔ اگر ادیب کا یہ مجموعہ منظرِ عام پہ آجاتا تو ٹمل ناڈو کے افسانوی ادب میں یقیناً ایک اضافے کی حیثیت رکھتا۔

سعد اللہ ممتازؔ[1] اور راجی صدیقی

یہ دونوں فن کار ایک دوسرے کے ہم جماعت ہونے کے ساتھ ساتھ ہم نوالہ اور ہم پیالہ بھی تھے۔ ممتاز کا زیادہ تر رجحان اردو شاعری اور مضمون نگاری کی طرف تھا تو راجی صدیقی کا طبعی میلان شاعری اور افسانہ نگاری کی طرف۔ ان دونوں فن کاروں کی نثری اور شعری تخلیقات ٹمل ناڈو کے مقتدر رسائل "معیارِ ادب" وشارم "مشعل" اور "پاکیزہ" مدراس میں جگہ پا چکی ہیں۔ ان دونوں فن کاروں کے نثر پارے ایک عجیب کشش انگیز کیفیات سے مملو تھے

بس۔ یم۔ حیاتؔ[2]

آپ ایک خاموش طبع مگر خوش فکر نثر نگار تھے۔ آپ نے ابتداً طبع زاد

---

[1] المتوفی ۱۹۸۹ء [2] المتوفی 1987ء

افسانے لکھے اور بعد میں تراجم کی طرف مائل ہوئے تو بس اسی کے ہو کے رہے۔ تمل، ملیالم، بنگالی اور اوریا (Oriya) زبانوں کے شاہ کار افسانوں کا ترجمہ اردو زبان میں اس اچھوتے اور کشش انگیز انداز میں کیا ہے کہ ترجمہ پر تخلیق کا گماں ہونے لگتا ہے۔ ہندو پاک کے افسانوی ادب میں آپ کی ایک خاص شناخت قائم ہو چکی ہے۔ آپ کے تراجم ہندو پاک کے کثیر الاشاعت رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان کے تراجم کا ایک مجموعہ "ویٹنگ روم"[1] فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومتِ اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔

نورس خیامی

آپ کے رومانی اور جاسوسی انداز کے افسانے مدراس کے متعدد رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ آپ افسانہ نگار سے زیادہ شاعر کی حیثیت سے مدراس کی فضا میں کافی مقبول ہیں۔ حضرت کاوش بدری کی معیت میں آپ بھی اردو ادب کی دنیا بہت زیادہ ہنگامے برپا کر چکے ہیں۔

کے۔ آر۔ حسینی

آپ شہر مدراس کے ماحول کے خاص الخاص ادبی ماحول میں ناول نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کا ناول "ننگا ماحول" 1958ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس ناول میں حسینی نے عورت کی بے بسی اور جنسی گمرہی کے خدوخال بڑے بہترین انداز میں اُجاگر کئے ہیں۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد آپ بمبئی کی فلمی دنیا کی طرف رجوع ہوئے اور آج تک اس دنیا سے باہر نہ نکل پائے۔

---

[1] اس مجموعہ کو یو پی اردو اکیڈمی نے بھی 1986ء انعام سے نوازا تھا۔

رشیدؔ[1] مدراسی اور عابدؔ صفی

یہ دونوں ٹمل ناڈو کے نمائندہ اور صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں۔

رشید نے افسانوں کے علاوہ دو ایک ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک ناول "ہیرو" مشورہ بک ڈپو۔ دہلی سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ "ہیرو" کے بعد موصوف کے ایک اور ناول کا مسودہ راقم الحروف کی نظر سے ۱۹۶۱ء میں گزر چکا ہے۔ رشید کی زبانی یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ شمال کے کسی اشاعتی ادارے نے ان کا یہ ناول غبن کرلیا ہے۔ رشید کے افسانوں اور ناولوں کا کینوس (Canves) بہت وسیع اور کشادہ ہوتا تھا۔ بالخصوص ان کے افسانوں کے کرداروں کا یہ کرشمہ ایک معرکہ سے کم نہیں ہے کہ وہ قاری کے سامنے اچھلنے کودنے اور بولنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس عابدؔ صفی کے افسانوں کے ہلکے پھلکے موضوعات میں زندگی کی بعض سچائیوں کا رس اور تلخیوں کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔ عابدؔ صفی نے افسانوں کے علاوہ تنقیدی اور ادبی خاکے بھی لکھے ہیں۔ آپ کی دو غیر مطبوعہ تصانیف "ٹمل ناڈو کی اردو صحافت کی تاریخ" اور "ٹمل ناڈو میں اردو نثر کا ارتقاء" آپ کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں ممد اور معاون ثابت ہوتی ہیں۔

مہرؔ راعت آمبوری، صباؔ مصطفےٰ، امیر الضیاء

یہ تینوں فنکار ٹمل ناڈو کی بہترین افسانہ نگار ہیں۔ مہرؔ اور صباؔ کے افسانے ہندوستان کے مقتدر رسائل میں جگہ پاچکے ہیں۔ انسانی نفسیات پر مہرؔ اور صباؔ نے بڑی گہرائی اور ژرف نگاہی سے روشنی ڈالی ہے، اس کے برعکس امیر الضیاء نے اپنے معاشرے کی برائیوں کی نقاب

---

[1] المتوفی ۱۹۸۷ء

کشائی بڑے تیکھے انداز میں کی ہے۔

اعجاز شاکری اور کاظم نائطی

ان دونوں حضرات کے نام اور کام ٹمل ناڈو کے اردو ادب میں بہت معتبر مقام رکھتے ہیں۔ 1975ء سے 1981ء تک جو جمود اور سکوت ٹمل ناڈو کی ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا اس کو توڑنے اور ہفت روزہ" اتحاد" کے ذریعہ شعری اور نثری فضا کو دوبارہ معطّر و منوّر کرنے میں خاص رول ادا کیا ہے۔ ان دونوں حضرات کی ایماء پر راقم الحروف اور حسن فیاض کو اپنے اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے مواقع بھی نصیب ہوئے۔ ٹمل ناڈو کے اس دور کو واقعی اردو ادب کا جلوہ فشانی دور کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں حضرات کے ادبی، تنقیدی مضامین سوانحی خاکے اور افسانے روزنامہ" اتحاد" مدراس، "روزنامہ سالار" بنگلور میں جگہ پا چکے ہیں۔ خاص طور پر راقم الحروف کے فن اور شخصیت کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے لکھی ہوئی کتاب" لہجہ تراش" کاظم نائطی کی فکری، علمی اور تنقیدی صلاحیتوں کی پہچان بن چکی ہے۔ اعجاز شاکری کے تبصرے، صحافتی مضامین بھی ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کو اردو ادب کا محقق کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

انور ربّانی اور حسن فیّاض

ان دونوں فن کاروں نے افسانوی ادب کی دیواروں پر چند ایسی ان دیکھی تصویریں چسپاں کی ہیں جن کے کاغذی پیرہن کے نقوش اردو ادب میں ہمیشہ جاوداں رہیں گے۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کی سوچ سے جو نئی کرنیں پھوٹی ہیں وہ کاغذی دنیا کو روشن ہی نہیں کرتیں بلکہ ان کے افسانوں کے قارئین کو نئے افسانے کے مزاج، نئی کیفیت، نئے زاویے اور نئی آفاقی

وسعتوں سے بھی آشنا کرتی ہیں۔

حبیب اللہ شاہ مدراسی

آپ نے جس سنجیدگی اور متانت کے ساتھ طالب علمی کے دور میں ادب کے میدان میں قدم رکھا آج بھی اسی نیک نامی کے ساتھ شہرِ مدراس کی ادبی فضا میں مشہور و معروف ہیں۔ ٹمل ناڈو کے اہم ترین شعراء پر آپ کے سوانحی خاکے سالنامہ "فانوسِ خیال" مدراس میں شائع ہو چکے ہیں۔ چند سال پہلے اپنے پیر و مرشد حضرت حافظ سید حبیب محمد حسن القادری چشتی کی زندگی کے واقعات اور مدراس کی اس عظیم ترین متبرک شخصیت کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ایک ضخیم کتاب "حیاتِ قلندری" ترتیب دی ہے۔ موصوف کی یہ تالیف اُن کی بہترین صلاحیتوں کی غمّاز ہے۔

فیّاض حسین۔ فضل جاوید اور فخر اعجاز

ان تینوں حضرات کو ٹمل ناڈو کا افسانوی ادب ہمیشہ یاد رکھے گا حالاں کہ انہوں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں مگر جو کچھ بھی لکھا ہے واقعی ادب کی بارگاہ میں ایک حسین تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تینوں افسانہ نگاروں کے افسانے مدراس کے جرائد اور کتب مثلاً "گلِ نو" (مطبوعہ 1967ء) "روشنی کے بھنور" (مطبوعہ 1967ء) پریسیڈنسی کالج، مدراس کے سالنامہ "ضیا" (مطبوعہ 1963ء تا 1965ء) وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ فیاض اور فضل جاوید کے افسانوں میں ہمارے معاشرے میں سانس لینے والی برائیوں کا عکس بڑے نرالے اور تیکھے انداز میں پایا جاتا ہے۔ فخر اعجاز کی ذہنی اور علمی تربیت حالاں کہ مدراس کے ماحول میں ہوی لیکن ان کے افسانے کشمیر کی حسین وادیوں اور جھرنوں کے

دھر گیتوں کے ساتھ ساتھ شملہ کی کوہستانی فضاؤں سے باتیں کرتی ہوئی خوشگوار خوشبو سے لبس ہوتے ہیں۔

صلاح الدّین برقؔ

ٹمل ناڈو کا وہ اہم ترین فن کار ہے جس نے نہ صرف اردو افسانوی ادب کو اپنی ذہنی تجلّیات سے منوّر کیا بلکہ تراجم سے اردو زبان وادب کے خزانے کو بھی مالامال کیا ہے۔ خاص طور پر خلیل جبران کے تراجم اردو زبان میں پیش کرنے کا اعزاز برقؔ کو حاصل ہے۔ موصوف کے تراجم کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے تراجم پڑھتے وقت قاری کے رگ و پے میں شعری آہنگ اور کلاسیکی رچاؤ کا احساس جمالیاتی کرنیں بکھیرنے لگتا ہے۔

شبیب[1] احمد کاف

شبیب احمد ٹمل ناڈو کی سرزمین سے بڑی سرعت اور بلند حوصلگی کے ساتھ ابھرنے والا فن کار ہے۔ چند ہی سال کی مشق و مزاولت سے ہند و پاک کے بہترین رسائل پر چھا جانے والی اور افسانوی ادب سے کم عمری میں روٹھ جانے والی بلاغِ د بہار شخصیت کو اردو ادبی دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔ موصوف نے اپنے اکثر افسانوں میں روزمرّہ زندگی میں وقوع پذیر واقعات کا ایک ہلکا سا عکس بڑے روشن اور نمایاں انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اپنی بات کو بڑے دل کش اور خوش نما اظہار میں قاری تک پہنچانے کے فن سے شبیب بہت خوب واقف تھے۔ اور یہی گُر ان کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔

---

[1] شبیب نے ۷ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ورنگل حیدرآباد میں انتقال کیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

غیاث اقبال[1]

آپ ٹمل ناڈو کے باشعور و باصلاحیت نقاد اور نثر نگار تھے۔ آپ کی نثر شہرِ مدراس کے تمام تر نثر نگاروں سے مختلف ہے۔ اس طرح کی اسلوبیاتی نثر ہندوستان کے دو تین نثر نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔ آپ کی تحریروں میں علمیت کے ساتھ ساتھ ثقالت کا احساس قاری کے ذہن و دل کو اثر انگیزی سے باز رکھتا ہے۔ ہند و پاک کے اکثر و بیشتر جرائد میں موصوف کی نگارشات شائع ہوتی رہی ہیں۔

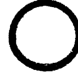
متذکرۂ بالا نثر نگاروں کے بعد راقم الحروف کا خیال ہے کہ ٹمل ناڈو میں اردو نثر کے ایک دور کا اختتام بڑے شان دار پیمانے پر ہوا ہے اور اس دور میں جو بھی علمی، ادبی، تنقیدی، تحقیقی اور تالیفی کام ہوا ہے وہ ٹمل ناڈو کے اردو ادب کا بہت تابندہ اور درخشاں دور ثابت ہوا ہے۔ 1950ء سے 1990ء کے درمیان ٹمل ناڈو میں تصنیف و تالیف کا کام بھی خوب سے خوب تر ہوا جس کا اعتراف ابھی کوئی کرے نہ کرے آنے والا وقت ضرور کرے گا۔

آج کل نئے لکھنے والوں کی صف میں افتخار حیات، سجاد ظہیر، قاضی حبیب احمد، ایمن الماس، احمد ندیم اور سجاد بخاری وغیرہم ہیں، جو شہر مدراس کے ادبی افق کو اپنی تخلیقی کدو کاوش سے اردو نثر کو نئی روشنی دینے اور وسعت و کشادگی کی مہک سے معطر کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں ✤

اسلامیہ کالج وانم باڑی 'یومِ اردو'
میں پڑھا گیا مقالہ (1992ء)

---

[1] ڈاکٹر غیاث اقبال نے دل کا دورہ پڑنے کے سبب دسمبر 92 کو وفات پائی۔ ✤



ٹمل ناڈو میں اردو افسانہ

ٹمل ناڈو کا افسانوی ادب اپنی متنوع خصوصیات کی بنا پر قابلِ ذکر سہی لیکن عمر اور نشوونما کے اعتبار سے شاعری کے برعکس درخورِ اعتنا نہیں کیوں کہ ٹمل ناڈو کے فن کاروں نے جہاں شعری ادب اور نئے رجحانات کو لگن، انہماک اور دل چسپی سے اپنایا وہیں دوسری اصنافِ ادب سے قطع نظر افسانہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی۔ افسانہ، ناول اور ڈرامہ نویسی کی اصناف نے کل ہند سطح پر ترقی کی جو مراحل طے کئے میری اپنی معلومات کے مطابق ٹمل ناڈو ان اصنافِ ادب کو اپنانے میں دوسری ریاستوں کی بہ نسبت بہت پیچھے ہی رہا۔

ٹمل ناڈو کی صد سالہ ادبی تاریخ کا تدریجی تجزیہ کیا جائے تو راقم کا خیال ہے کہ پچھلے بیس، تیس سال کے عرصہ میں کوئی ایسا افسانہ نگار اس سرزمین سے نہیں ابھرا جس کو ہم کرشن چندر، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، عصمت اور احمد ندیم قاسمی کی صف میں کھڑا کر سکیں۔ جتنی سج دھج اور دھوم دھام سے

یہاں شاعری ہوی ہے اس مقام کو افسانوی ادب نے نہیں چھوا۔ پھر بھی خوشی کی بات یہ ہے کہ یہاں کے بعض فن کاروں نے سنجیدگی کے ساتھ صنف افسانہ نگاری کو بھی اپنانے کی کوشش کی اور ان کی تخلیقات ہندوستان کے مقتدرہ جرائد میں شائع بھی ہوی ہیں۔

اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ ٹمل ناڈو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ اردو کی بہ نسبت ٹمل کا افسانوی ادب اتنا اونچا اور معیاری رہا ہے کہ ٹمل افسانوں کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ خصوصًا میدانِ سیاست کے شہ سوار اور دانا ئے راز آنجہانی شری راج گوپال چاری کے مختصر تامل افسانوں نے کافی مقبولیت حاصل کی اور کئی زبانوں میں ان کے افسانوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ مشکل یہی ہے کہ تامل ناڈو میں اردو اور تامل فن کاروں کے درمیان نہ کوئی ادبی اشتراک ہے نہ کوئی فکری ہم آہنگی۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اکثر اردو کے فن کاروں کا یہ حال ہے کہ انہوں نے کبھی اردو ادب سے دل چسپی لی نہ ہی اس زبان کی تخلیقات سے استفادہ کرنے کا رجحان ان میں پیدا ہوا۔

تامل ناڈو کے اردو افسانوی ادب کی عمر زیادہ نہیں ہے، لیکن اس قلیل مدت میں بھی یہاں کے افسانہ نگاروں نے زمانہ کی بدلتی ہوی قدروں اور تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تخلیقات میں انفرادیت پیدا کی ہے جو یقینًا قابلِ تحسین ہے۔ انہوں نے اردو کو بہت کچھ نہ دیا ہو لیکن جو کچھ دیا ہے یہ سرمایہ بھی تامل ناڈو کے ماحول، حالات اور افتادِ طبع کے پیش نظر بہت غنیمت ہے

ذیل میں چند افسانہ نگاروں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

ادیب بھارتی
المتوفی ۱۹۷۱ء

ادیب بھارتی کو مرحوم لکھتے ہوئے خامہ خون چکاں ہوتا ہے تو انگلیاں فگار... وہ

زندہ دل، باغ و بہار شخصیت کے مالک تھا۔ اس نے زندگی بھر اردو کی خدمت کی، فن کے حق کو پہچانا اور اپنی تخلیقات کو اپنے لہو کے ایک ایک قطرے کا حساب دیا۔ ادیب بھارتی تامل ناڈو کا پہلا فن کار ہے جس نے تند جذبات اور شدتِ احساس کے ساتھ نظم جدید کو اپنایا۔ دراصل پہلے وہ شاعر ہے اور بعد میں افسانہ نگار۔ اُس کے اندر جو افسانوی خصوصیات پنہاں تھیں وہ اس کی نظموں سے عیاں ہوتی ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے اپنے مزاج کی اُفتاد اور اپنی طبیعت کے تقاضے کو پہچانا پھر افسانہ نگاری کی طرف اس خطرناک حد تک توجہ دی کہ آخر کار افسانہ لکھتے لکھتے وہ خود ایک افسانہ بن گیا۔

راز امتیاز

راز امتیاز جہاں شاعر، صحافی اور نقاد ہیں، وہیں ایک افسانہ نگار بھی ہیں اگرچہ انھوں نے ایسے افسانے بھی اردو ادب کو دئے ہیں جن سے اُن کے ذہن و فکر اور فنّی صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔ راز امتیاز کے افسانوں میں نفسیاتی تحلیل کے ساتھ ایک ایسا لطیف عنصر بھی پایا جاتا ہے جس میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کے ذہن کی سطح پہ سوچ کی جو لہر اُبھرتی ہے وہ بتدریج جانے پہچانے آفاق کو چُھو جاتی ہے۔ راز امتیاز کے افسانے کے دریچوں سے چھننے والی روشنی کبھی دھند کی شکل اختیار کرتی ہے تو کبھی صبحِ درخشاں۔ راز امتیاز ابلاغِ خیال کے سلسلے میں ڈنڈا لے کر پیچھے نہیں پڑتے بلکہ ان کے احساسات موضوع کی ست رنگ بوتل میں خود بخود اترتے چلے آتے ہیں۔ راز امتیاز کے ذہنی پس منظر میں زندگی کا کرب بھی ہے اور نشاطِ غم بھی یقین ہے کہ اردو کا مستقبل راز کے سوا گت کے لیے خود آگے بڑھے گا۔

رشید مدراسی[1]

رشید مدراسی کی تخلیقات کی عمر بھی کافی طویل ہے۔ وہ ایک زمانے سے لکھتے رہے ہیں۔ ان کے طبع زاد افسانے بھی ہندوستان کے مقتدر رسائل میں جگہ پاچکے ہیں۔ اور ان کے ناول "ہیرو" کو مشورہ بکڈپو دہلی نے شائع کیا ہے جو کافی مقبول ہوا ہے۔ انہوں نے جتنا بھی لکھا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے اس کی افادیت ہمہ گیری اور دل کشی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موصوف کا اسلوبِ نگارش نہ پریم چند سے ملتا ہے اور نہ کرشن چندر سے البتہ وہ دونوں کے بین بین ضرور چلتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا موضوع اکثر رومانی رہا ہے۔

علی اکبر آمبوری

علی اکبر آمبوری کی شخصیت تامل ناڈو کے افسانوی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے ابتدا ہی سے اس صنفِ ادب کی طرف خاص توجہ کی اور ان کے افسانے ہندوستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ علی اکبر آمبوری کے افسانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خواجہ احمد عباس کے اسلوبِ نگارش سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ جدیدیت کا اطلاق ان کے افسانوں پر اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ اس دور کی پیداوار ہیں جب کہ عباس، کرشن چندر اور ان کے ہم عصروں کا ہنگامہ تھا۔ موصوف کی تخلیقات میں اگرچہ حیات و کائنات کی ہم آہنگی اور ژرف بینی کے عناصر نہیں پائے جاتے لیکن افسانوی ماحول دل کو چھو جانے والا ضرور ہوتا ہے۔ ان کے یہاں چونکانے والی کیفیت ہونے کے باوجود اس میں وہ شدّت نہیں ہے جو منٹو کے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ موصوف کے افسانوں کا مجموعہ "برف سی اُجلی" منظرِ عام پر آچکا ہے۔ جو تامل ناڈو کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔

---

[1] المتوفی ۱۹۸۷ء

ایس۔ایم۔حیاتؔ[1]

ایس۔ایم حیات طبع زاد افسانوں سے زیادہ ترجموں کے سلسلہ میں بے حد مشہور ہیں۔ انہوں نے تامل، انگریزی، ہندی، بنگالی اور ملیالی افسانوں کے ترجمے بکثرت کئے ہیں۔ لیکن ان کے ترجمہ شدہ افسانوں میں بھی اردو کا اپنا ایک خاص مزاج ملتا ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد محسوس نہیں ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔ طبع زاد تخلیق کی انفرادیت ان کے افسانوں میں جا بجا ملتی ہے۔ زبان اور فن پر بھرپور دسترس حاصل ہونے کی وجہ سے حیاتؔ نے اردو کے افسانوی ماحول کو بالکل سازگار بنایا۔

مہر طلعت آمبوری[2]

تامل ناڈو کی خواتین میں مہر طلعت آمبوری کی ادبی شخصیت ہر اعتبار سے قابلِ ذکر ہے۔ چوں کہ مہر طلعت کا ماحول ادب، زبان اور ان کے دائرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور پردے کی سخت پابندی کی وجہ سے اُن کے مزاج میں جو گھٹن کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس کے پیشِ نظر جب ہم ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک حیرت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ قفس میں رہ کر بھی طاقتِ پرواز کی یہ شان ان کی انفرادیت کو اُجاگر کرتی ہے۔ موصوفہ کے بعض افسانوں کے مطالعہ سے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ شہ پارے کیا اُس ماحول کے پروردہ ہیں، جہاں قدم قدم پر پابندی ہی نہیں بلکہ فن کار کی آواز بھی پابہ زنجیر ہوتی ہے۔ ان کے افسانے "شمع" "بیسویں صدی"، "بانو" اور دوسرے رسائل میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے ہیں۔

---

[1] المتوفی ۱۹۸۷ء [2] المتوفی ۱۹۹۲ء

عابد صفی

عابد صفی کا نام تامل ناڈو کے افسانوی ادب میں سرِ فہرست نہ سہی لیکن آپ نے دیکھتے ہی دیکھتے قلیل مدّت میں ترقی کے مراحل تیزی سے طے کئے۔ عابد صفی کے افسانے "بیسویں صدی"، "نیا دور" اور دوسرے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جمالیاتی عنصر ان کے افسانوں میں زیادہ پایا جاتا ہے مگر اسی کے ساتھ زندگی اور کائنات کے سلسلہ میں عمق کا فقدان ہے۔ نہ انہوں نے جدیدیت کو اپنایا ہے اور نہ ان کا زاویۂ نگاہ رجعت پسندی سے تعلق رکھتا ہے۔ میانہ روی ان کی تخلیقات کی اہم خصوصیت ہے۔ اگر وہ برابر لکھتے رہیں اور رومانیت سے قطع نظر عصری تقاضوں، سماجی قدروں اور نئی کروٹوں کو بھی اپنی تخلیقات میں سمونے کی کوشش کریں تو یقین ہے کہ افسانوی ادب کی تاریخ میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیں۔

فضل جاوید

فضل جاوید نے اگرچہ بہت کم لکھا لیکن اتنا ضرور لکھا ہے کہ ہم انہیں بحیثیت افسانہ نگار فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کے افسانوں میں طنز و مزاح کا لطیف عنصر پایا جاتا ہے جو انہیں احمد جمال پاشا سے قریب کر دیتا ہے۔ جذبات کا ہیجان متوازن صورت میں ان کی تخلیقات کا جز بنتا ہے۔ ٹمل ناڈو کے دوسرے افسانوی مجموعے "روشنی کے جھنوز" میں فضل جاوید کی تخلیقات بھی جگہ پا چکی ہیں اور ان کی تخلیقی صلاحیت کو تامل ناڈو کے منجھے ہوئے فن کاروں نے بھی سراہا ہے۔

حسن فیّاض

حسن فیّاض اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس پہ ہر اعتبار سے جدیدیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ ابتدا ہی سے اُن کا رجحان جدیدیت کی طرف رہا ہے۔ انہوں نے نظموں

اور افسانوں میں علائم کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات کو معمہ نہیں بنایا۔ ابلاغ کے سلسلہ میں ان کی کوششیں ہمیشہ راست باز رہی ہیں۔ ان کی تخلیقات کے کردار ہمارے ہی اپنے سماج کے چلتے پھرتے، سانس لیتے، مہکتے، مسکراتے اور سسکتے ہوئے انسان ہیں۔ ان کے افسانوں میں سپاٹ پن کے عنصر نے کبھی جگہ نہیں پائی جن فیّاض کی تخلیقات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے زندگی اور سماجی مسائل کو جس طرح سنجیدگی کے ساتھ سوچا اسی طرح انہیں فن پارے کا روپ بخشا۔

موصوف نے اپنا افسانوی مجموعہ ترتیب دے دیا ہے۔ اگر یہ مجموعہ منظرِ عام پر آئے گا تو یقیناً ان کی فکری جلوہ گری، فن کارانہ بلند پروازی اور آج کے عصری تقاضوں اور نئی آگہی کا آئینہ دار ثابت ہوگا۔

صلاح الدّین برق

صلاح الدین برق کی شخصیت ست رنگ دھنک کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ انھیں شاعر ہونا چاہیے تھا یا ہیرو ــــ لیکن انہوں نے اپنے وجود کے اندر چھپے ہوئے ہیرو کو مختلف رنگ و آہنگ اور مختلف روپ میں اپنی تخلیقات کے اسٹیج پہ لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی طبیعت کی برقی رو تخلیق کی آگ میں تپ کر سنجیدگی کی فضا میں سانس لینے لگی ہے۔ انہوں نے اب تک اردو ادب کو جو کچھ دیا ہے ادب کا مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ خلیل جبران سے صلاح الدین برق کی دلی وابستگی اور فکری ہم آہنگی کا زندہ ثبوت ہے۔ خلیل جبران کی تخلیقات نے ہمیشہ اُن کے احساس کے دروازے پر دستک دی ہے۔ ان کے یہاں حقائق کے ماحول میں جو ماورائی کیفیت ملتی ہے وہ انسان کو تلخابۂ ہستی کی گرہ کشائی پہ مجبور کر دیتی ہے۔ صلاح الدین برق کی جبران سے وابستگی ان کے

زاویۂ نظر کو واضح کرتی ہے۔ ان میں ابھرنے کے اچھے امکانات ہیں۔ امید ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی وہ ان امکانات کی لچک کو کم کرنے کی بھولے سے بھی کوشش نہیں کریں گے۔

سبیل عرفان

سبیل عرفان کے افسانے ایک ایسی سچائی اور حقیقت کے غماز ہیں جسے کوئی بھی قاری جھٹلا نہیں سکتا۔ آپ کے کچھ افسانوں سے بڑی یاسیت ٹپکتی ہوی نظر آتی ہے اور یہی ان کو اوران کے افسانوی فن کو بہت اونچا بھی اٹھاتی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں دس بارہ افسانے لکھے ہوں گے لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں احساسات کی تھرتھراہٹ، جذبات کی لو اور خلوص ومحبت کی صناعی ملتی ہے۔

اعجاز شاکری

اعجاز شاکری کو ہلکے پھلکے کرداروں کو بڑے اچھے اور تیکھے انداز میں پیش کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ آپ کے افسانوں میں آج کی روزمرّہ اور سماجی زندگی میں سانس لینے والی اچھائیوں اور برائیوں کی بہت ساری جھلکیاں نمایاں طور پر ملتی ہیں تامل ناڈو کے افسانوی ادب میں آپ کے افسانے واقعی قابلِ توجہ ہیں۔

یعقوب اسلم

یعقوب اسلم کے افسانوں کی زبان نہایت صاف، شیریں، شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ آپ کی عبارت میں کہیں جھول نظر آتا ہے نہ کہیں اظہارِ علمیت چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے پتے کی باتیں نہایت آسانی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد قاری کو الفاظ کی بھول بھلیوں اور علائم کی تاریک اور ناآشنا گلیوں میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ آپ کا

افسانوی مجموعہ "چہروں کی دیوار" مطبوعہ 1986ء فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی مالی اعانت سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔

کاظم نائطی

آپ تامل ناڈو کے نقاد[1]، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے اکثر افسانوں کے پلاٹ نئے نئے سے ہیں اور پیش کرنے کے انداز میں تیکھا پن اور چونکا دینے والے نقوش ملتے ہیں۔ وہ آج کے افسانوی ادب کا خاصہ ہیں۔ آپ نے شاعری کی طرح افسانوں کو بھی یکسوئی اور اپنائیت کے ساتھ سمجھنے اور برتنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ تساہل سے کام لیا ہے۔ ورنہ آپ کی شخصیت اور فن آفاق گیر شہرتوں کا منبع ہوتا۔

اعجاز

آپ کے افسانوں میں بہترین منظرکشی کے ساتھ ساتھ نظم کا آہنگ صاف جھلکتا ہے۔ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی آپ نے افسانہ کو شاعری کی سی زبان عطا کی ہے۔ کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ نثر میں شاعری کا رس نچوڑ رہے ہیں۔ آپ کے افسانوں کی یہ خصوصیت تامل ناڈو کے اکثر احباب کے ذہنوں میں جلوہ فگن ہے۔

محمد فیاض حسین

محمد فیاض حسین بمقام مدراس 1943ء میں پیدا ہوئے۔ 1960ء سے 1968ء تک فیاض یہاں کے ادبی محفلوں اور شعری نشستوں کی کارروائی میں ہمارے

---

[1] آپ کا ایک تنقیدی مجموعہ "لہجہ تراش" 1965ء میں شائع ہوچکا ہے جس میں علیم صبا نویدی کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

(راز امتیاز، کاوش بدری، ادیب بھارتی، انور ربانی، حسن فیاض، علیم صبا نویدی، نثار رضوی، صلاح الدین برق اور فضل جاوید) ہمسفر رہے۔ انہوں نے شاعری سے زیادہ نثر کی طرف توجہ دی۔ بالخصوص افسانوی ادب میں ان کی شناخت آج بھی محفوظ ہے۔ زندگی کے روزمرہ مسائل اور ان مسائل سے جنم لینے والی اچھائیوں اور برائیوں کو اپنے مختصر ترین افسانوں میں بڑے اچھے اور تیکھے انداز میں منعکس کرنے کے فن سے فیاض بخوبی واقف ہیں۔ اگرچہ انہوں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں۔ لیکن جتنے بھی لکھے ہیں۔ وہ تامل ناڈو کے اردو افسانوی ادب میں ناقابلِ فراموش ہیں۔

فیاض نے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد اردو ادب سے مستقل طور پر کنارہ کشی اختیار کرلی۔ میں یہی کہوں گا کہ اگر فیاض حسین، صلاح الدین برق اور فضل جاوید جیسے جینیس فن کار دوبارہ ادب کی طرف رجوع کریں تو یقیناً ان کے تخلیقی جواہر پارے تامل ناڈو کے اردو ادب میں اضافہ ثابت ہوں گے۔

انور کمال

انور کمال کے افسانے آج کے دور کے حالات، احساسات اور جذبات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں ایک اچھا افسانہ نگار بننے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔ بشرطیکہ خاص لگن اور مسلسل انہماک کے ساتھ یہ ورشِ لوح و قلم کرتے رہیں۔

غیاث اقبال

غیاث اقبال کا ہر افسانہ پلاٹ کے اعتبار سے بالکل نیا ہونے کے علاوہ آج کی آگہی سے بہت زیادہ میل کھاتا ہے۔ ان کے یہاں کرداروں کے پیش

کرنے کا ڈھنگ بھی بڑا چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ انہوں نے افسانے کو نئے زاویے دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔[1]

صبا مصطفٰی

محترمہ صبا مصطفٰی کا ذہنی رشتہ تامل ناڈو سے بہت گہرا ہے۔ اس لیے کہ ان کی علمی اور ادبی تربیت میں اس سرزمین کی مٹی کی سوندھی خوشبو کا بہت زیادہ دخل ہے۔ باوجود یہ کہ ان کا خمیر ہندوستان کے سدا بہار خوشگوار اور خوب صورت جزیرے "انڈمان" سے بنا ہے تاہم ان کی ذہنی پرورش و پرداخت تامل ناڈو کے جیّد اور مستند شعراء کے درمیان میں ہوئی۔

محترمہ صبا مصطفٰی کے افسانے جدید دور کے عکاس نہ سہی لیکن ان میں برائیوں، گندگیوں اور رسوبتوں میں رینگتے ہوئے جراثیم سے مقابلہ کرنے بلکہ اپنے طور پر انھیں ہلاک کرنے کی بڑی حد تک صلاحیت موجود ہے۔

شبیب احمد کاف

شبیب کی علمی ادبی تربیت وانمباڑی کے دینی اور مذہبی ماحول میں ہوئی یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر افسانے "اسلامی نظریات" کے دائرے کے چکر لگاتے ہیں انسانی نفسیات کی دھوپ چھاؤں اور احساس کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی کیفیات سے ان کے افسانوں کا خمیر تیار ہوتا ہے جو زندگی کے نشیب و فراز سے انھیں بہت زیادہ قریب کر دیتا ہے۔

---

[1] المتوفی 1992ء (موصوف سے اردو ادب کو بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں لیکن وقت سے پہلے موصوف کا اچانک ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک ناقابلِ فراموش سانحہ ہی نہیں بلکہ اچانک علمی ادبی چشمے کا خشک ہو جانا بھی ہے۔

اکبر زاھد

اکبر زاہد کی ذہنی تربیت میں بھی وانمباڑی کے ادبی ماحول کا بہت زیادہ دخل ہے

ان کے افسانے جدید عصری رجحانات کے حامل ہیں۔ ان کے ہاں عرفانِ ذات کے دریا میں غوطہ لگا کر موتی ڈھونڈ نکالنے کا عمل بہت روشن ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک دن ضرور اس عمل میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مندرجۂ بالا جدید دور کے افسانہ نگاروں کے علاوہ تامل ناڈو کے افسانوی ادب میں حبیب خان سروش داؤدی، عزیزہ تمنائی، دانش فرازی راہی صدیقی، عبدالمتین ہوش، رشید احمد فاروقی، مصباح اللہ، ساحل رشید اور آنند مدھوکر (فرحت کیفی) کی تخلیقات بھی "سفینہ"، "فانوسِ خیال"، "معیارِ ادب"، "مصحف"، "زندگی"، "پاکیزہ"، "مشعل"، "فلم دیش"، "ساون"، "ادبی رپورٹ"، "اتحاد" ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہوار جریدوں میں جلوہ افروز ہیں۔

متذکرہ بالا افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری کو تفریحی مشغلہ تصوّر کرتے ہوئے ہلکے پھلکے افسانے (جو سطحی جذبوں سے مزین تھے۔) لکھے۔ جن سے افسانوی فن کو فروغ ملا نہ زندگی لیکن دانش فرازی، ساحل رشید، آنند مدھوکر (فرحت کیفی) کے افسانوں میں انشائیہ پن بہت زیادہ نمایاں تھا اور کہیں کہیں ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات ہیں عصری آگہی کے واضح خدوخال بھی اجاگر ہوئے ہیں۔ تعجب اس بات کا ہے کہ شمال کے فکشن کے نقادوں کے علاوہ خود مدراس کے اربابِ علم وفن نے یہاں کے بہترین افسانہ نگاروں کو اپنی تحریروں میں قابلِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے کورذہنی سے کام لیا ہے۔

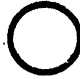
افسانوی میدان سے ہٹ کر تامل ناڈو کے معدودے چند

فن کاروں نے ناول کی طرف توجہ دی ۔ جن میں مولانا فیضی صدیقی ، رشید مدراسی راز امتیاز ، کے آر جبینی ، علی اکبر آمبوری ، امیر الضیاء ، صبا مصطفیٰ ، علیم صبا نویدی کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔

رشید مدراسی نے تین چار ناول لکھے ۔ ان میں سے ایک ناول "ہیرو" مشورہ بکڈپو دہلی سے شائع ہوا ۔ کے ۔ آر جبینی کا ناول "ننگا ماحول" حیدر آباد سے اور امیر الضیا کا ناول "عنبرین" مدراس سے طبع ہوا ۔ مولانا فیضی صدیقی کے جاسوسی ناول (جن کا ذکر ان کے باب میں آئے گا) آج بھی اشاعت کے مرہونِ منت ہیں ۔ راقم الحروف کا ناول " ادھورا پیار " جس میں آج کی فکری اور فنی اڑانوں کا جائزہ لیا گیا ہے' اپنی تازگی کے احساس کے ساتھ نجی لائبریری کی زینت بنا ہوا ہے ۔ راز امتیاز کا ناول جو آدھے سے زیادہ مکمل ہو کر اپنے آخری موڑ کے انتظار میں ہے ۔ اور صبا مصطفیٰ کے دو ناول ان کی الماری میں پڑے اشاعت کے انتظار میں ہیں ۔

من حیث المجموع تامل ناڈو کے فنکار کسی اعتبار سے بھی اردو علم و ادب کی دنیا میں کبھی پیچھے نہیں رہے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شہرت کے افق کو چھو نہیں پائے اور انھیں وہ وسائل اور سہولتیں بھی میسر نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اونچا اٹھا کر اپنی خدا داد صلاحیتوں کو دنیائے ادب سے آشنا کر سکیں ۔ ●●

بشکریہ " ٹمل ناڈو میں اردو "
ترقی اردو بیورو ۔ نئی دلّی



تامل زبان ــ جدید افسانہ نگار

دُنیا کی قدیم زبانوں میں تامل (Tamil) بھی ایک قدیم زبان مانی جاتی ہے۔ ہزاروں سال کی عمر رکھنے والی یہ زبان اور اس کا ادب بھی بہت پُرانا اور کئی خصوصیتوں کا حامل ہے۔ جدید، جدید تر کے علاوہ قدیم کلاسیکی ادب کے بھی کئی ادوار بتائے جاتے ہیں۔ جن میں سے تین ادوار کا کافی مواد پایا جاتا ہے۔ ان ادوار کی تاریخوں اور زمانوں کا تعین ابھی تک محققینِ السنہ سے نہیں ہو سکا ہے۔ ان تین قدیم ادوار کی نشو و نما میں مختلف انجمنوں اور مجلسوں نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ جو اس عہد کے دانش وروں اور اہلِ قلم حضرات پر مشتمل رہی ہیں۔ انھیں مجلسوں میں اس دور کی نئی نئی تصنیفات وغیرہ پیش کی جاتیں اور ان پر تنقید و تبصرہ اور جرح و قدح ہوتی اور اس طرح اس ادب کو ترقی کی سمت لے جانے کی بھرپور کاوشیں ہوتی رہیں۔ لہٰذا ان ادوار کو مجلسی ادوار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعد میں چل کر آہستہ آہستہ تامل زبان نے اپنی وسعت و گیرائی سے مختلف علاقوں

ین اپنے قدم جمانے شروع کر دیئے اور دو ایک مرکز سے ہٹ کر اس کے کئی ایک مرکز قائم ہو گئے ـــــــ اہلِ زبان کے نقطۂ نظر کے مطابق اس کو تین حصوں میں یعنی اس کے ادبی افذار کو تین صنفوں میں سمو دیا گیا۔

ا۔ ایّل (E.L) (نثری ادب) جو اس کے کلاسیکی دَور کے اواخر تک بہت ہی قلیل اور نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔

2۔ اِی سئے (Easai) (موسیقی) منظوم ادب (جو اس کی بنیادی صنف بھی ہے)

3۔ ناٹک (فنونِ لطیفہ) تیسری صنف جو ناٹک کہلاتی ہے اس صنف کی عظیم کاوش سلّیپدی گارم (Sillappadhi Garam) ہے جس کو پڑھنے کے بعد یہ حیرت انگیز بات سامنے آتی ہے کہ ہزار سال پہلے کی یہ تحریر آج کے جدید تر ادب کے بالکل مماثل ہے۔ اسی طرح پُرانا نور (Poor Na noor) اور (Agghay Nanoor) نامی تامل ادب کی پرانی کتابوں میں سینکڑوں مختصر افسانے لکھے ہوئے ملیں گے۔ جس دور میں راجہ مہاراجہ حکومت کر رہے تھے اور ان کے سوا کسی اور کی بات نہیں چلتی تھی اس وقت بھی اس کے ادب میں عوام ہی کی عکاسی کی جاتی رہی۔ مثلاً بہادری، عشق و محبت، غم و الم اور اپنے معاشرے کے مسائل پر مشتمل افسانے لکھے جاتے رہے ہیں اور ان میں سے تقریباً پورے کا پورا ادب منظوم ہی نظر آتا ہے۔ اور نثری ادب کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں چلتا۔

آج کے دور میں لکھے جانے والے افسانے کی ارتقائی شکل کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نوع کی صنف کے وجود کا پتہ اس زبان میں ستّر اسّی سال پیشتر چلتا ہے دوسری زبانوں کی طرح مغرب نے بھی اس کے

ادب کو کافی متاثر کیا ہے اور مغرب زدہ اہلِ قلم نے پوری پوری تقلید میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ بایں ہمہ تامل ادب کی خصوصی چھاپ برقرار ہے اور وہ تامل کلچر اور اس کی ماحولی ہئیت کا عکاس ہے اور پورے ارتقا کے باوجود کلاسیکل انداز کی جھلکیاں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں ۔

مختصر افسانہ نگاری کے فروغ کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں فرصت کی کمی حارج نہیں ہوتی ، اس کے بالمقابل ناول طویل وقت کے متقاضی ہوتے ہیں ۔ تامل افسانہ نگاری کو فروغ دینے میں اور ارتقائی منزلوں تک پہنچانے میں تامل کے موقر ماہناموں منی کوڈی (Mani Kodi) (جواہرات والا جھنڈا) ندئی (Nadai) (چلن) کساڈا پترئی (Kasada patrai) نیان رتھم (Nana Ratham) نے بہت اہم رول ادا کئے تھے ۔ ان ماہناموں کے ذریعہ اس صنف کی بڑی آبیاری ہوی اور وہ دنیا کی دوسری زبانوں کی اس صنف کے برابر درجے والی صنف شمار کی گئی ۔ مختصر افسانہ نگاری کے مقابل ناول کا سرمایہ بالکل کم اور دوسری زبانوں کے مقابلے میں کسی بھی اہمیت کا حامل نظر نہیں آتا ۔ اکثر و بیشتر ناول نگار آج افسانہ نگاری کی طرف ہی لوٹ آئے ہیں اس لحاظ سے افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی ٹیم موجود ہے ۔ جن کا اجمالی جائزہ بھی اس مضمون میں مشکل ہے ۔ تامل زبان کے چند ایک چوٹی کے افسانہ نگاروں کا تذکرہ فی الحال اجمالی ہی پیش کرنے کی یہاں گنجائش ہے ۔

ذیل میں تامل کے چند مشہور افسانہ نگاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے ۔

پدومئے پتّن (Pudumaipittan) (جدّت کا دیوانہ) اس قلمی نام سے مشہور اور مختصر افسانہ لکھنے والے فن کار نے پہلے پہل ایک اور نام سے لکھنا شروع کیا تھا اور اسے اس وقت کوئی قبولیت

نہیں ملی تو اس نے آگے چل کر اپنا قلمی نام بدل دیا اور پُڈو مئیے پِتّن کے نام سے
آج وہ مختصر افسانوں کا بڑا ماہر فن کار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے افسانے آج
کے بے حد پسندیدہ اور معیاری افسانے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس نے تامل زبان
کو سنسکرت زبان کے بوجھل اور مشکل الفاظ سے پاک کرنے کے علاوہ سادہ
سلیس اسلوب بخشا ہے جس سے خواص کے ساتھ عوام بھی متاثر ہوئے بغیر
نہ رہ سکے۔ اور اس کے افسانوں کی قدر و قیمت، مقبولیت اور مانگ آج
بھی اتنی ہی ہے جتنی کل تھی۔

جے کانتن (JAI KANTHAN)

ابتدائی زمانے میں دنیا بھر کی بہت ساری تکلیفیں
اور اذیتیں اٹھانے والی یہ شخصیت کمیونزم (Communism) کی طرف
بے حد مائل تھی۔ اگنی پرویسم (Agni poruvasam) نامی اس کا ایک
افسانہ تامل کے مؤقر جریدہ آنندا وکڈن (Ananda Vikdan) میں شائع
ہوا تھا۔ یہی افسانہ اس کی فوری مقبولیت کا ضامن بنا۔ اس افسانہ میں ایک
برہمن دوشیزہ کو ایک مال دار نوجوان لفٹ دینے کے بہانے بھگا لے جاتا ہے
اور اس کی آبرو لوٹ لیتا ہے۔ اس دوشیزہ کی ماں اس جان لیوا واقعہ سے
بے حد متاثر ہوتی ہے اس کی بے بضاعتی اور جھنجھلاہٹ کے گرد
گھومتا ہوا یہ افسانہ فن کی انتہائی بلندیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔
اور اس کی مانگ زینہ بہ زینہ، منزل بہ منزل اتنی بڑھتی ہے کہ آخر کار اس
افسانے کے تخلیق کار کو اسی واقعہ کو وسعت اور کشادگی دے کر ایک ناول
کا روپ دینے کا موقعہ میسر آتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اسی کہانی کو پردۂ فلم پہ منتقل
کئے جانے کی صورت مہیا ہو جاتی ہے ــــ یہی نہیں بلکہ اس ایک افسانہ پر

طنز و تنقید کرتے ہوئے کئی ایک قلم کاروں نے مختلف افسانے بھی لکھے لیکن اس افسانہ کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوی ۔ اسی افسانہ نگار نے ایک اور افسانہ " ور پڈی سور" (Our padi Sore) (ایک سیر کھانا) میں جھونپڑ پٹیوں اور انتہائی تنگ و تاریک ماحول میں بسنے والے مجبور انسانوں کی مفلوک الحالی کی منظر کشی کی ہے اور اس گندے ، گرے ہوے ماحول کے پروردہ لوگوں کی خاص زبان اور لہجے کو اس طرح منتقل کیا ہے کہ اس زبان کا بھی ادب میں ایک خاص مقام متعین ہوجاتا ہے ۔ اس فن کار سے پیشتر کسی اور فن کار نے اس طرح کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسی افسانہ نگار کا ایک اور افسانہ " وہ کس کے لیے رویا" بہت سوز و گداز کا حامل ہے اور تامل ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس فن کے کئی ایک افسانوں میں افسانہ " پیارس کو پو" (Parry's ku po) "پیارس کو چلو" آج کے جدید انداز اور نقطۂ نظر کا آئینہ دار ہے۔ اس افسانے میں ایک مصوّر اور اُس کے فنِ مصوّری پر بڑے اچھوتے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس سے ہٹ کر اس افسانہ نگار کے بہت سے افسانے انقلابی خیالات اور مساوات و برابری کے نظریات کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ۔ اور اس کے یہ تمام تر افسانے فنّی اعتبار سے اور مقبولیت عامہ کی سند رکھتے ہیں اور تامل افسانہ نگاری کی تاریخی بارگاہوں میں اپنا اَن مٹ نقش ثابت کر چکے ہیں ۔

سندر راماسوامی تامل کے بہترین افسانہ نگاروں میں ایک ہے۔ جس کے قلم کی شگفتہ کاری ، عجیب کیف و تاثر کی حامل ہوتی ہے ۔ اس افسانہ نگار کا ایک افسانہ

(Pullai Marathu Kadai) "املی کے درخت کی سرگزشت" حیرت انگیز اور اثر آفریں ہے۔ مختلف النوع حالات اور واقعات کو املی کے درخت کی زبانی اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا خود کو ایک املی کا درخت محسوس کرنے لگتا ہے ایک جامد اور ساکت مخلوق کے آگے کئی متحرک مخلوقات، کئی ادوار کا گزر ہوتا ہے اور یہ چلتی پھرتی تصویروں کے روپ میں پیش ہوتے ہیں جس سے ذہن و فکر کافی متاثر ہوتے ہیں۔ آخر کار کہانی کا انجام حد درجہ رقت انگیز ہو جاتا ہے۔ جب کہ کئی ایک واقعات و مشاہدات کے شاہد و گواہ اور زمانے کے سرد و گرم سے آشنا، اس درخت کو کاٹ کر پھینک دینے کا درد انگیز منظر اس انداز سے سامنے اُجاگر کرتا ہے کہ بے اختیار قاری کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور قلم کار کا قلم جادو جگاتا نظر آتا ہے۔

دیون (DEWAN)

دنیا سے اٹھ جانے والے اس فن کار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے افسانوں کی دنیا میں بڑی سرعت اور قلیل عرصہ میں اپنا ایک خاص مقام اپنی منفرد طرزِ نگارش کی وجہ سے بنا لیا ہے۔ اس افسانہ نگار کی تخلیقات میں طنز و مزاح، کے علاوہ تحیّر و تجسّس اور سنسنی خیز ماحول اور واقعات کی نت نئی پھلجھڑیاں افسانوی فضاؤں میں چھوٹتی ہوئی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اس کے افسانوں کا ایک عالم گرویدہ ہے۔ آج بھی اس کی تحریریں تامل افسانوی ادب میں اپنی ساکھ قائم رکھے ہوئے ہے۔

کلکی (KALKI)

آر۔ کرشنا مورتی نام سے منسوب اس فن کار کا قلمی نام "کل کی" ہے۔ اس نے بھی تامل ادب اور افسانہ نگاری کو جدّت اور نئی آگہی بخشی اور طرزِ افسانہ نویسی

کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ تاریخی اور معاشی ماحول کی تصویر کشی میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔

پل ایس راما امرتم

تامل افسانہ "پلاک تو کی گل" (Pallakku Thuki Ghal)

پالکی اٹھانے والے") کہاروں سے متعلق "گوٹو میلم" (Gottu Melum) "نفس انسانی اور خواب" جیسے عنوانات پر انتہائی پیچیدہ قسم کے مسائل کو بڑے سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے کا خاص سلیقہ رکھتا ہے۔ مذکورہ افسانے تامل زبان کے شاہ کار افسانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

اشوکا مترن (ASHOKA MITHRAN)

اس افسانہ نگار کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے شہریوں کا پوسٹ مارٹم کرنے کے علاوہ دیہاتوں کی مجبور زندگی اور ان کی بدحالی کی "پریم چند" کی طرح بڑی اچھی متاثر کن عکاسی کی ہے۔

اس افسانہ نگار کے آیندہ افسانے یقیناً تامل افسانوی ادب میں اضافے کا باعث بنیں گے۔

سجاتا (SUJATA)

اس نام سے لکھنے والی نہیں بلکہ لکھنے والے افسانہ نگار کی فکری کاوشیں بھی عوام میں خاصی مقبول ہیں۔ اس تخلیق کار کے طرزِ تحریر کا نوجوان طبقہ بڑا دلدادہ اور گرویدہ ہے۔ اور اس کی تقلید کو ایک فن سمجھتا ہے۔

ٹی۔ جانکی رامن (T. JANKIRAMAN)

یہ افسانہ نگار بھی مختصر اور جدید افسانوں کے میدان میں کافی مشہور اور معروف ہے۔ اور اس کے کئی ایک ناول بھی منصۂ شہود پر آ کر شہرت کی بلندیوں کو چھو چکے ہیں۔

شِوشنکری (SIVA SANKARI)

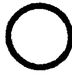
اندومتی (INDUMATHI)

لکشمی اور (LAKSHMI)

انورادھا منّن (ANURADHA MENON)

یہ چاروں خواتین افسانہ نگار آج کی ابھرتی ہوی فن کارہ ہیں۔ ان کے افسانے آگے چل کر ~~~~~ چل کر اردو ادب سے عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور صالحہ عابد حسین کے رنگ کے حامل ہو سکیں گے۔ آج بھی ان خوانین کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے عوام میں پڑھے جاتے ہیں۔

بہ تشکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ
نشر 1985ء



غالب کا ایک ہمعصر.... لطیف آرکاٹی....

قامل ناڈو کی تین سو سالہ تاریخ ادبِ اردو کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ آج سے تین سو سال پہلے ہی اردو غزل نے اس سرزمین پر ایک فضا تیار کرلی تھی اور خصوصیت سے نوابانِ آرکاٹ میں نواب غلام غوث خان اعظم کے دور میں اس کو بھرپور ترقی، سرفرازی و سربلندی عطا ہوئی۔ نواب غلام غوث خان اعظم کے دَور کو ہم اردو غزل کا زرّین اور سنہرا دور کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

نواب غلام غوث خان بہادر اعظم نہ صرف بڑے ہی ادب نواز، نکتہ شناس، دیدہ ور تھے بلکہ خود بھی ایک ادیب اور شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے دورہ (1820ء تا 1855ء) میں ایک ایسے مشاعرے کی بُنیاد ڈالی تھی جس کے میرِ مجلس افضل الشعراء مولوی محمد حسین خان راقم جو بقول جہدی واصف (مؤلف حدیقۃ المرام[1] 1278ء)

---

[1] مترجم "حدیقۃ المرام" سخاوت مرزا (مطبوعہ انجمن ترقیٔ اردو، پاکستان۔

"گلزارِ اعظم" کے مؤلف بھی تھے۔ اس مشاعرے کی مثال سارے ہندوستان میں تو کیا بلکہ ایران میں بھی نہیں ملتی۔ مشاعرے کی نوعیت ایسی تھی کہ ہر شاعر کے کلام پہ بر سرِ محفل با قاعدہ تنقید ہوتی تھی۔ الفاظ کی تحقیق، زبان اور اسلوب سے متعلق مناسب مدلّل اور موثر تاثرات کا اظہار ہوتا تھا۔ نواب غوث خان اعظم بہ نفسِ نفیس خود ان مشاعروں کی صدارت کرتے تھے۔ تنقید کے سلسلہ میں ان کا فیصلہ اٹل سمجھا جاتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ تنقید اور جوابِ تنقید، پھر فیصلہ، یہ سب کچھ نہایت خوش گوار اور سازگار ماحول میں ہوتا تھا۔ اور کوئی کشیدگی یا رنجش کی بات پیدا نہیں ہوتی تھی۔ نواب غوث خانِ اعظم کے دربار سے سُرخ رُو اور فیض یاب ہونے والے شعراء کی فہرست کا صحیح اندازہ ہمیں "تذکرۂ گلزارِ اعظم" کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ اس تذکرے سے ہٹ کر غلام غوث خان اعظم کے آخری دَور میں سید سیف الدین لطیفؔ آرکاٹی جیسا خود دار، منکسر المزاج اور اپنے وقت کا جیّد شاعر بھی اپنی تنگ دستی کی وجہ سے ان کی مدح سرائی کرتے ہوئے مالی امداد حاصل کرتا ہے۔ ۵

یا غوثؓ[1] رکھ سلامت نواب غوث خاں کو	لاکھوں کی پرورش کو یہ یک اِمبرلس ہے
کیوں نہ اس کے[2] مدح عالی میں کروں فکرِ سخن	قدر کچھ اہلِ سخن کی ہے تو اس کے پاس ہے
یہ مختصر قصیدہ بولا لطیفؔ گرچہ	مقبول غوث[3] ہوں تو یہ دل پذیر بس ہے

---

[1] غوث الاعظمؓ دستگیر

[2] "کے" لطیفؔ کے ہاں بعض "مؤنث" الفاظ "مذکر" میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس طرح کے اغلاط اُس دَور کے شعراء کے کلام میں موجود ہیں۔ مخطوطات میں کی کو کے بھی لکھا جاتا ہے۔

[3] نواب غلام غوث خان اعظم

ٹمل ناڈو کو ادبی تاریخ شاہد ہے کہ دربارِ نوابانِ آرکاٹ میں ہمیشہ شعراء اور ادباء اور جید علماء کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ نوابانِ آرکاٹ کی وسیع النظری اور فراخ دلی ہندوستان کے ہر گوشہ میں مشہور تھی۔ عادل شاہی سلطنت کی تباہی کے بعد دور دراز مقامات سے بہت سے شعراء اور علماء آرکاٹ اور ویلور آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن آج تک یہ بات مستند طور پہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی کہ لطیفؔ آرکاٹی نے اپنے وطن شرزہ پور (میسور) کو کیوں اور کب خیرباد کہا اور آرکاٹ کو کیوں اپنا مسکن بنایا۔ مؤلف "بقائے دوام" سید احمد ایڈوکیٹ (بنگلور) لطیفؔ آرکاٹی کا تعارفی خاکہ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"حافظ محمد خان جویہ (جو شرزہ پور کے جاگیردار اور نواب اور لطیفؔ آرکاٹی کے مربّی اور محسن بھی تھے) کے انتقال 1206ھ م 1790ء کے بعد لطیفؔ نے اپنا وطن ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر آرکاٹ کا رُخ کیا" لیکن لطیفؔ کے یہ اشعار دیکھیے: ؎

اسم اس فیاض عالم کا یہی معروف تھا	حضرتِ حافظ محمد خان جویہ، مشہور ہے
یک ہزار و دو صد شش سال کی ہجری میں وہ	راہئ جنّت ہوا، سجدے میں سو مذکور ہے
جا زیارت کو تو اُس فیاضِ عالم کی لطیفؔ	مرقدِ عالی پہ جس کے حق کا دائم نور ہے

دوسرے شعر سے لطیفؔ کے محسن حافظ محمد خان جویہ کی تاریخ وفات کا اندازہ ہوتا ہے مگر تیسرے شعر کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے حافظ محمد خان جویہ کی وفات سے پہلے ہی لطیفؔ نے شرزہ پور چھوڑ دیا تھا۔

احمد اللہ خان مرحوم (مدیر "جمہور" بنگلور) نے ماہنامہ "مخزن"[1] میں اپنے مضمون میں "میسور کا ایک نامور شاعر۔ لطیفؔ آرکاٹی" میں لطیفؔ کی تاریخ

---

[1] "مخزن" شمارہ نمبر 8: مطبوعہ 1959ء

پیدائش اندازاً 1178ھ م 1764ء اور تاریخِ وفات 1289ھ م 1876ء بتائی ہے۔
انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ لطیفؔ کی وفات کی تصدیق مدراس کے مشہور و معروف شاعر
مولانا عبدالرحمٰن خان بہادر شاکرؔ مدراسی (ثیمہؔ ارکاٹی کے پوتے) اور اُن کے برادر
محمد منورؔ حسین خان بہادر گوہرؔ مدراسی (مولف سخنورانِ بلند فکر: مطبوعہ 1937ء) سے کی ہے۔

مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم (وفات 1984ء بمقام پاکستان) نے
لطیفؔ کی تاریخ پیدائش اندازاً 1770ء قرار دی ہے۔ اور یہ بھی اقرار کیا ہے کہ لطیفؔ
1790ء سے بہت پہلے آرکاٹ آچکے تھے[1]۔ لیکن تاحال تلاش و تحقیق کے باوجود
لطیفؔ کی صحیح تاریخِ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا۔ لطیف کے کلام کی اندرونی شہادتوں
سے اس کے وطن چھوڑ دینے کا پس منظر یوں اُجاگر ہوتا ہے۔ ؎

کب تک پڑا رہے گا تُو اپنے وطن کے بیچ | عزت نہیں ہے گُل کو مقامِ چمن کے بیچ

ایک تصویر وطن چھوڑنے کی یوں بھی کھینچی ہے: ؎

مانندِ گل چمن سے جب تک نہ ہو جدا | اہلِ ہنر کی قدر نہیں ہے وطن کے بیچ

گویا لطیفؔ کے فن کی قدردانی خود اپنے وطن میں نہیں ہوئی تو اس نے دِل
برداشتہ ہو کر شترزہ پور سے ترکِ وطن کر کے آرکاٹ میں مستقل سکونت اختیار کی۔

لطیفؔ کے شترزہ پور چھوڑنے کا ایک اور سبب اپنے بڑے بھائی سے
نااتفاقی ہے جو خود اس کے اپنے کلام سے واضح ہے۔ اس ناچاقی کے برسوں بعد
جب [illegible] کے کچھ بھتیجے اس سے ملنے آرکاٹ آئے تو لطیفؔ نے ترکِ وطن کا
ذکر اُن سے یوں کیا ہے ؎

اے رفیقو تمہارے خاطر تڑپ رہا ہے چچا تمہارا
ذرا تو پوچھو بدر سے اپنے کہاں ہے بابا چچا تمہارا

---

[1] ماہ نامہ "معیارِ ادب" بنگلور: مطبوعہ اکتوبر 1951ء

حرم میں جاکے تم اُس کے خاطر ہر ایک پتھر سے اتنا پوچھو

ہمارے بابا کی سنگدلی سے ہمارا آخر چچا سدھارا

بڑے بھائی اور اپنے رشتہ داروں کی جدائی نے لطیف کے دل و دماغ کو قریب قریب مجروح کر دیا تھا۔ لطیف نے بقول احمد اللہ خان مرحوم "سولہ سال کی عمر میں بہت صدمے اٹھائے اور زمانے کے دکھ جھیلے تھے"۔ راقم کا خیال ہے کہ لطیف نے اسی ذہنی خلفشار اور دلی رنجشوں سے رستگاری حاصل کرنے کے لیے بیس سال کی عمر میں (ٹیپو سلطان کی شہادت 1213ھ سے پہلے) آرکاٹ آیا اور یہیں شادی کی اور صاحبِ اولاد ہوا۔ لیکن وقت کی ستم ظریفی نے لطیف کو یہاں بھی آرام اور سکون سے زندگی بسر کرنے نہ دیا۔

بدقسمتی سے لطیف کو نہ بیوی ہم خیال ملی اور نہ ہی فرماں بردار اولاد۔ اس خیال کی توثیق لطیف کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔ ؎

جو ترے بندے ہیں صالح پاک باطن اے لطیف

عصمت و غیرت کے اُن کو پارسا عورات دے

(بمعنی نیک)

عورتِ نیک سے ہے مرد کو آرام لطیف نہ ہو ایسا تو جئے لگ ہے وہ جوڑا گھوڑا

وہ اپنی اولاد کے ناخلف اور ناہنجار ہونے کا رونا یوں روتا ہے: ؎

عجب کام، قسمت کا گولہ ہوا میں بیرا تھا خرما سندولا ہوا

(بمعنی بونا)

تخم لیمبو جہاں بوتا ہوں تو ہوتا ہے نیم ایسے تخمِ بد کے یاں بونے سے نہ بونا بھلا

نوحؑ کا بیٹا بھی ہو تو صاف کہہ دینا لطیف ناخلف اولاد کے ہونے سے نہ ہونا بھلا

بیوی اور اولاد کے رنج و غم نے لطیف کی شاعری کو کس طرح جِلا

بخشی اس کا اندازہ درج ذیل شعر سے ہوتا ہے۔ ؎

کب رسائی تھی شعر کو میرے   یہ مری آہ کی رسائی ہے

بڑے بھائی، بیوی اور اولاد کے ساتھ ساتھ لطیفؔ کو دنیا والوں سے بھی نفرت ہو چکی تھی اور اُسے یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ یہ دنیا بڑی مطلب پرست، خود غرض اور ریا کار ہے۔ ؎

عجب بر دنیا کی بے وفائی لطیفؔ دیکھا تو اے عزیزو
نہ شکرِ نعمت کسی میں باقی نہ کس میں قدرِ نمک ہی ہے
(یہاں کس میں کی بجائے کسی میں ہونا چاہیے)

میں نے دنیا کے کیا یاتوں سے توبہ توبہ   کر چکا اس کے خراباتوں سے توبہ توبہ

- عجب رنگ دنیا کا دیکھا لطیفؔ   کہ یاں زاغِ صحرا بگولہ ہوا

لطیفؔ نے جس مذموم دور میں سانس لی تھی اُس دور کے عوام کی تعریف اس نے بہت حسین انداز میں کی ہے۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے آج بھی ان کی نسل آرکاٹ کے مضافات میں موجود ہو۔ ؎

اُمیدِ قوم بد سے ہرگز کبھی نہ رکھیئے   جگ میں وفا کسی سے کرتے ہیں کب کمینہ

آگے چل کر لطیفؔ اس قوم سے متعلق کہتا ہے کہ اس قوم کے لوگ بظاہر آئینہ صفت اور آئینہ رو ہیں مگر ان لوگوں کا دل کینہ سے بھرا ہوا ہے۔ ؎

آئینہ رو کو ہرگز دل صاف تم نہ سمجھو   مانندِ تیغ کے یہ رکھتے ہیں رنگِ کینہ
منہ اوپر صاف ہے جو دل سے منافق ہے لطیفؔ   ایسے کم ظرف کو تم دل میں کبھی مت جا دو

پتہ نہیں کس کم ظرف نے لطیفؔ کو گالی بھی دی تھی مگر لطیفؔ سادات سے تھا اس نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنے دل کو یوں سنبھالا دیا تھا: ؎

گالی کا غم نہ کیجیے کسی حال میں لطیف — اکثر جہاں میں دیتے ہیں سالے و سالیاں

اور پھر انہیں گالیوں کے تحفے کو لطیف اشاروں اور کنایوں میں ڈھال کر اشعار کی خوشبوئیں عطا کرتا ہے : ؎

کیا سخت ہیں صبا ترے گلشن کے مالیاں — بلبل کے آہ و نالے پہ دیتے ہیں گالیاں

گالی گئی ہوا پہ تو ہنس ہنس کے گل سبھی — برگِ چمن سے مل کے بجاتے ہیں تالیاں

گالی سے سخت تر ہے بُری بات یار کی! — سچ ہے کہ سو سُنار کی تو ایک لُہار کی

لوہار

لطیف بڑی عجیب صفات کا مالک تھا۔ وہ ان کم ظرفوں اور ظاہری شرافت داروں کے درمیان رہ کر بھی اپنے شریف اور نجیب الطرفین ہونے کا دعوے کرتا رہا : ؎

کم تر ہوں بندگانِ الٰہی سے اے لطیف — طرفین سے اگرچہ نسب میں شریف ہوں

اور پھر وہ ببانگِ دہل کہتا ہے : ؎

ثابت ہے احادیث سے تکریم ہماری — واجب ہے مسلمانوں پہ تعظیم ہماری

سادات کی ہے قدر اُسی حق شناس کو — جس کو خدا رسول کا ہے پاس و امتیاز

لطیف نے جہاں اپنے نیک، صالح اور شریف ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہیں شرفا میں جن صفات کا ہونا ضروری ہے اس کا اظہار یوں کیا ہے : ؎

صاحب وہی شریف وہی، نامور وہی — جگ میں کیا جو زندگی شرم و حیا کے ساتھ

لطیف کی شاید انہیں صفات نے نواب غوث خان اعظم کا دل موہ لیا تھا۔ آخر ش نواب غوث خان اعظم کی نوازشات کا لامتناہی سلسلہ اس قدر جاری رہا کہ لطیف نے گنج سوائی حضرت قادر ولیؒ ناگوری اور ہند الولی خواجہ معین الدینؒ چشتی غریب نواز اجمیری کی مقدس زیارت سے

مشرف ہونے کے بعد حج کے لیے بھی کمر باندھی ..... ان مقدّس مقامات پر پہنچ کر اس نے غوث خانِ اعظم کے لیے جو دعائیں مانگیں وہ حسبِ ذیل ہیں: ؎

نواب غوث خاں کے لیے عرض ہے یہی | مانندِ خضر عمر ہو اس کی درازوطول
کعبہ میں پہنچ کر یہ دعا مانگے ہے لطیف | یارب ہمارے شاہ کی نت عمر ہو دراز
کمی کس بات کی ہرگز نہ ہوگی | کسی سیّد کی اس گھر کو دُعا ہے

کعبہ شریف سے واپس آنے کے بعد لطیف کا طبعی میلان ایک نئے رُخ کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ جس کا اظہار اپنے اشعار میں یوں کرتا ہے: ؎

دل میں آتا فقیر ہو جانا | یا کسی کے اسیر ہو جانا
اہلِ باطن کی فیضِ صحبت سے | مثلِ روشن ضمیر ہو جانا
رختِ دنیا کو کر کے خاکستر | عاشقِ بے نظیر ہو جانا

آخر ش ایک دن لطیف کی تلاش وجستجو کا دامن کامیابی و کامرانی کے پھولوں سے بھر جاتا ہے اور وہ بھی اپنی عمر کی آخری ساعتوں میں: ؎

میں جو پیری میں پیر کو پایا | خضر سے دستگیر کو پایا
دل مرا جس طرح سے چہتا ہے | ویسے روشن ضمیر کو پایا

چاہتا ہے

دل مرا کیوں نہ اب منوّر ہو | میں نے مہرِ منیر کو پایا
بعدِ مدت لطیف قسمت سے | مرشدِ بے نظیر کو پایا

آخر میں وہ اپنے پیرو مرشد کے ترفع کا اظہار بھی کرتا ہے: ؎

اے شہابِ اوجِ عزت، واقفِ اسرارِ دیں | ہمچو نورِ صبح روشن، کاشفِ علمِ یقیں

اور پھر اعترافِ فیضانِ پیر کی ایک تصویر یوں روشن کر دیتا ہے: ؎

یا الٰہی تا بہ دورِ مہر و مہ تابندہ دار
فیضِ مولانا شہابؔ الدین بروئے زمیں

لطیفؔ کے ہم عصر شعراء

لطیفؔ کے معاصر مدراسی شعراء میں :

۱۔ غلام اعزالدین خان بہادر نامیؔ سنہ 1181ھ تا سنہ 1240ھ م 1767ء تا 4..ء
مصنفِ مثنوی "نو بہارِ عشق"، "بہارستانِ عشق"، "سلیمان نامہ" اور "داغستانِ عشق"۔

۲۔ نورالدین خان محمد حشمتؔ: سنہ 1204ھ تا سنہ 1269ھ م 1789ء تا سنہ 1852ء

۳۔ خانِ عالم خان فاروقؔ: 1207ھ تا 1271ھ م سنہ 796اء تا سنہ 1892ء

۴۔ مولوی عبدالقادر ناظرؔ 1200ھ تا سنہ 1243ھ م 1785ء تا سنہ 1827ء

ط۱ مولانا سید شہاب الدین سے متعلق؛

پروفیسر میر محمود حسین اپنے مضمون "ویلور نامہ" میں رقم طراز ہیں کہ مولانا ایک زمانے تک ویلور میں سکونت پذیر تھے اور وہ اپنی آخری عمر میں بیسور آئے اور میسور ہی میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔

جناب اکرام کاوش مولفِ "داستان میسور" (مطبوعہ 1989ء) لکھتے ہیں کہ مولانا مدرسۂ لطیفیہ ویلور کے فارغ التحصیل تھے اپنی آخری عمر میں سری رنگ پٹن آئے اور وہیں اپنے آبائی مکان بنام "قادر اولیاء مکان" میں رہتے تھے۔ مولانا اپنی آخری سانس تک سلوک و معرفت کی تعلیم دینے میں مصروف رہے۔

مولانا راہی فدائی اپنی تازہ ترین تحقیق کے مطابق تحریر فرماتے ہیں: مولانا' حضرت قبلہ قطبِ ویلور کے خلیفہ بھی تھے۔

ط۲ محمد منور خان گوہر مدراسی "سخنورانِ بلند فکر" (مطبوعہ سنہ 1937ء) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

۵۔ لطف النساء اثیمہ آرکاٹی : ۱۲۶۶ھ تا ۱۳۴۱ھ م ۱۷۴۹ء تا ۱۸۲۵ء)
مصنفہ مثنوی "گلبن مہ رخاں"، "گلشن مہوشاں" اور "گلشنِ شاہداں"
کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا پانچوں شعراء کا رجحان فارسی شاعری کی طرف بہت زیادہ تھا۔ حالاں کہ یہ شعراء اپنے دور کے اچھے اور معتبر شاعروں میں سے تھے۔ مگر ان کے شعری کارناموں کی رسائی صرف مدراس کے خاص الخاص حلقوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور ان شعراء میں شمالی ہند کے ادبی مسلّمات سے انحراف کرنے کی ہمت تھی نہ اُن کی کھینچی ہوی لکیر سے آگے بڑھنے کی جرات ..... مگر لطیف اپنی بھرپور شعری صلاحیتوں کے ساتھ شمالی ہند کے شعراء میں برابر کا شریک رہا۔ کہتا ہے: ؎

نہ سمجھو فکرِ تازی ہے سخن میں آج کل میری ۔۔۔ نیاں ہندوستاں تک تو گئی اکثر غزل میری

اثیمہ نے اپنے کلام میں شمالی ہند کے ان شعراء کی مذمت بھی کی ہے جو اپنی عالمانہ استعداد کا سکہ اوروں پر بٹھانے کے لیے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ؎

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) ۳ "محبوب الزمن" (جلد دوم) عبدالجبار ملکاپوری
"خانوادۂ بدرالدولہ" مولانا یوسف کوکن عمری (مطبوعہ)

۱ اثیمہ آرکاٹی۔ تاریخ ولادت اور وفات حضرت کاوش بدری کے مضمون "آرکاٹ کے قدیم شعراء سے لی گئی ہے۔
"مدراس کی ایک جیّد شاعرہ" سخاوت مرزا (مطبوعہ "نوائے ادب" بمبئی ۱۹۵۴ء) اور "تذکرۂ نسوانِ ہند" فصیح الدّین بلخی۔ بہار مطبوعہ ۱۹۵۶ء

فارسی شعر کے کہنے میں نہ تم لاف کرو   پہلے ہندی میں تو کچھ اپنی زبان صاف کرو
جو کہ اپنی ہی زباں کہنے میں افصح نہ ہوا   فارسی اس سے کہاں بنتی ہے انصاف کرو

لطیف نے اپنی زبان کو ہندی بتاتے ہوئے یوں کہا ہے: ؎

وضع میری اگرچہ رندی ہے   پر فصیح ہوں زبان ہندی ہے

شعر گوئی کے دعوئی کے سلسلے میں لطیف کا شعر بھی قابلِ ذکر ہے: ؎

شعر گوئی کا جو کرے دعوے   خود نمائی ہے خود پسندی ہے

لطیف کے ہم عصر شعراء شمالی ہند میں

شمالی ہند کے شعراء میں مرزا رفیع سودا 1713ء تا 1781ء، خواجہ میر درد 1719ء تا 1784ء، میر تقی میر 1722ء تا 1810ء، انشاء اللہ خان انشاء 1756ء تا 1817ء، انعام اللہ خان یقین جرأت اور بہادر شاہ ظفر 1775ء تا 1863ء کے علاوہ لطیف کے دیوان میں کسی اور کا ذکر نہیں ملتا۔ حالاں کہ اسی دور میں شمالی ہند میں ابراھیم ذوق 1789ء تا 1869ء، مومن خان مومن 1798ء تا 1851ء کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ پتہ نہیں لطیف نے ان شعراء کا نام کیوں نہیں لیا۔۔۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لطیف کے اندر انانیت کا عنصر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اسی لیے کہتا ہے: ؎

اشعار ما سلف کا مشتاق ہوں تو میں ہوں   شعرائے ہم عصر میں مشّاق ہوں تو میں ہوں

یہاں تک لطیف خواجہ میر درد سے بھی اپنے آپ کو بہت زیادہ دور بین دماغ رکھنے والا شاعر سمجھتا ہے۔ ؎

حضرتِ میر درد سے زاید   دُور بیں میں دماغ رکھتا ہوں

پھر بھی لطیف نے اپنے کلام میں سودا کی بہت زیادہ تعریف کی ہے۔

اور شاعری میں اس کی تقلید کو خاص طور پر پسند کیا ہے اور شمالی ہند کے جن شعراء
سے اُسے عقیدت تھی اس کا ذکر بھی کیا ہے ۔

سودا سے میر درد سے، جرأت، یقیں سے ہے انشاء سے اور تقی سے عقیدت مدام ہے
(میر تقی میر)

جس دور میں لطیف کی شہرت آرکاٹ سے نکل کر دلّی تک پہنچی تو
بہادر شاہ ظفر نے اس کو طرحی مصرع بھیج کر غزلیں بھی لکھوائیں۔ یہاں نمونتاً
چند شعر پیش ہیں : ؎

قلم تراش سے مت استخواں تراش کے پھینک
رواں نہ ہو تو قلم کی زباں تراش کے پھینک

اگر بہار کی رکھتا ہے آرزو دل میں !!!
تو گل کے واسطے شاخ خزاں تراش کے پھینک

لکھا لطیف کو شاہِ ظفر یہی مصرع
قلم تراش سے مت استخوان تراش کے پھینک

اچھی شاعری نہ تو علم کے بل بوتے پہ ہوتی ہے نہ لفظوں کی سجاوٹ اور
آرائش سے۔ ہاں بقول ڈاکٹر نجم الہدیٰ علوم و شعور کی ترقی سے شاعری ترقی
ضرور کرتی ہے ۔ جہاں تک راقم کا خیال ہے میں یہی کہوں گا کہ اچھی شاعری میں
جذبہ اور فکر بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کسی شاعر کے ہاں
صرف جذبے کی فراوانی ہوتی ہے تو کسی کے ہاں فکر کی گہرائی اور گیرائی .... اگر یہ
دونوں عناصر (یعنی جذبہ و فکر) ایک ساتھ ہوں اور دونوں کی سطحیں اور لہریں
متوازن ہوں تو شاعر کو آفاق گیر شہرتیں نصیب ہو جاتی ہیں ۔ غالبؔ کو اردو
ادب میں نیک نامی اور آفاقیت عطا کرنے والے یہی دو عناصر ہیں ۔ لطیف

غالب کا ہم عصر ہونے کے باوجود اردو ادب میں وہ مقام نہیں پا سکا جو غالب کو نصیب ہے۔ کیوں کہ لطیف کی شاعری میں صرف جذبے کی نشتریت ہے جو فوراً دل میں اُتر کر دل کی کائنات کو اپنی باہوں میں لے لیتی ہے مگر فکر کے اعتبار سے ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

ہماری اردو شاعری میں رمزیت کے جو کمالات ملتے ہیں وہ یقیناً دوسری زبانوں کے ادب میں ناپید ہیں۔ اردو شاعری میں رمز و کنایہ، ابہامیت اور تشبیہ و استعارات کی وجہ سے ایک خاص حسن، دل کشی اور تاثر پیدا ہو جاتا ہے اور شاعر کا مافی الضمیر اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ سامع کے ذہن میں اجاگر ہو جاتا ہے۔

غالب کہتا ہے : ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی | اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

لطیف کا یہ شعر پڑھیے : ؎

مشرب تو عاشقی کا بہت سخت ہے لطیف | ہر بوالہوس سے سچھ کو نبھایا نہ جائے گا
(سچ)

غالب

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف | عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

لطیف

دنیا میں سوز و درد کسی کا کسے نہیں | دیکھوں تو جس کو اپنے ہی مطلب کا آشنا
(کسی کو)

غالب کے ہاں جو لب و لہجہ کی متانت، زبان و بیان کی سنجیدگی، الفاظ کی بندش، جذبہ اور فکر کی نئی رنگینیاں ملتی ہیں اُس کی اُمید لطیف کے ہاں بے سود ہے اور غالب کی غزلوں میں جو کلاسیکی رچاؤ اور موسیقیت کی جو

جادوگری ملتی ہے وہ کسی اور شاعر میں موجود نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب ہماری شاعری کی کائنات پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اور آئندہ بھی اسی طرح شعری دنیا پہ مسلط رہے گا ۔

چلیے اب ہم ذرا لطیف کے معاصر شعراء کی شاعری اور اس تناظر میں جو عکس ابھرتے ہیں ان کے خدوخال پر بھی ایک نظر ڈالیں : ؎

بہادر شاہ ظفر ؎

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

لطیف ؎

بھول مت آبادئ دنیا پہ اے مردِ جہاں کام ہے درپیش آخر سب کو ویرانے کے ساتھ

یہ دونوں شعر ہم مرتبہ ہیں اور یہاں لطیف و ظفر دونوں ایک ہی مقام اور مرتبہ پر نظر آتے ہیں ۔

مومن خان مومن : ؎

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

اسی زمین میں لطیف کہتا ہے : ؎

ناحق جو ہم خراب ہوئے دلربا کے ساتھ اے کاش دل لگاتے ہم اپنے خدا کے ساتھ

لطیف اور مومن ہم عصر ہونے کے باوجود دونوں کے موضوعات اور خیالات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں لیکن مومن کا شعر نزاکتِ خیال اور تغزل کی بہترین مثال ہے ۔

سودا : ؎

جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا بلاکشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا

اسی زمین میں لطیف کہتا ہے : ؎

گنہ جو کر چکے پھر مت کرو ہوا سو ہوا   کرم تو حق ہے، لطیف سے ڈرو ہوا سو ہوا

اس شعر میں لطیف کی پرواز سودا کی اڑانوں سے زیادہ تیز ہے۔

میر تقی میر کی غزل کا یہ شعر بہت مشہور ہے : ؎

کل لے گئے تھے یار ہمیں بھی چمن کے بیچ   کہہ دیجیے صاف صاف اسی انجمن کے بیچ

جیسا کہ میر تقی میر کو ناقدینِ ادب اور شعرائے شمالی ہند نے اردو شاعری کا میر تسلیم کیا ہے اُسی طرح جنوبی ہند میں لطیف بھی اپنے دَور کا واحد شاعر تھا جس نے اپنی زندگی میں نہ سہی لیکن اپنی وفات کے سو سال بعد بھی ٹمل ناڈو کے شعری ادب اور عوام کے ذہنوں میں اپنی خاص جگہ متعین کر چکا ہے۔ آج بھی اس کے متعدد اشعار زبان زد خاص و عام ہیں اور روزمرہ زندگی میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غالب کا یہ شعر لیجیے : ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لطیف کہتا ہے : ؎

"اہلِ وفا" سے کام جو رکھتا ہے روز و شب   شکوہ نہیں ہے اس کو کسی بے وفا کے ساتھ

غالب کا شعر محض بیانیہ ہے اور اس کی مایوسی کا مظہر ہے مگر یہاں لطیف کے شعر میں ایک طرح کی رمزیت اور لطیف طنز پوشیدہ ہے۔

غالب کہتا ہے : ؎

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ   پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

لطیف کہتا ہے : ؎

خاکساروں کے قدم کی گرد پیدا کیجیے   شعر کہنا ہو تو پہلے درد پیدا کیجیے

ان دونوں اشعار میں غالب کی لفظیات بہت خوب صورت ہیں۔ یہاں غالب

کہتا ہے کہ وہی شعر دلوں پر اثر انگیز ہوتا ہے جس میں گداز ہو اور اس اثر کے لیے اہلِ سخن کے دل میں گداز کا ہونا ضروری ہے۔ شمع سخن کے فروغ کا راز اسی گداختگی میں پوشیدہ ہے۔ مگر لطیفؔ درد کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے شاعر دوستوں کو مشورہ دیتا ہے کہ شعر کہنے کے لیے پہلے دل میں درد کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

غالبؔ کا یہ شعر بھی آج تک ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہے : ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

لطیفؔ اسی خیال کو بہت عامیانہ انداز میں یوں پیش کرتا ہے : ؎

گالی کا غم نہ کیجیے کسی حال میں لطیفؔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

غالبؔ نے یہاں ایک بلند مقام سے گالیوں کے تعلق سے اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا ہے اور اُس کے عشق کے بارے میں جو خیالات ہیں انھیں کا ایک حصّہ ہیں مگر لطیفؔ کے ہاں گالیوں کا ردِّ عمل بہت معمولی اور سطحی ہے۔

آخر میں غالبؔ کا یہ شعر بھی سُن لیں جس کی گونج سے لطیفؔ متاثر ہو کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے : ؎

غالبؔ : ؎

یہ مسائلِ تصوّف یہ تیرا بیان غالبؔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لطیفؔ : ؎

عبث فکرِ سخن میں مَیں کیا ہوں عمر کو ضائع اگر ذکرِ خدا کرتا تو میں بے شک ولی ہوتا

غالبؔ نے اپنے شعر میں مسائلِ تصوّف کو اس طرح بیان کیا ہے جس طرح کوئی بادہ خوار بیان نہیں کر سکتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ مسائلِ تصوّف کو پیش کرنے کا حق ایک ولی ہی کو عطا ہے۔ یہاں لطیفؔ تصوّف اور اس کے مسائل کے سلسلہ

میں بہت معصوم لگتا ہے۔

اگرچہ لطیف نے اپنے کلام میں کہیں بھی غالب کا تذکرہ نہیں کیا ہے مگر یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ لطیف نے غالب کی فکر اور مضمون دونوں میں اپنی فکری جولانیاں دکھائی ہیں تو وہ ضرور غالب سے بھی متاثر رہا ہے اور ممکن ہے کہ غالب کو بھی لطیف کی شناسائی حاصل تھی ۔۔۔۔ دونوں میں کسی طرح کی رسم وراہ نہ ہونے کی وجہ سے غالب نے بھی لطیف کا ذکر کہیں نہیں کیا۔

میں نے اس مضمون میں لطیف اور غالب کا تقابلی مطالعہ کے بعد جن نتائج کا استنباط کیا ہے اس کا مطلب و مقصد ہرگز یہ نہیں کہ لطیف کی شعری عظمت کو گھٹایا جائے بلکہ لطیف کے دور میں شمالی ہند میں جن شعراء کا چرچا اوج پر تھا اور شاعری کی جو آوازیں گونج رہی تھیں محض ان کا سرسری جائزہ لینا ہے۔ لطیف کے کلام کے مطالعہ کے بعد اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ لطیف کی شاعری میں اپنے دور کے ہم عصر شعراء کی بڑی لطیف بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ ایک ایسے ماحول کا پروردہ تھا جہاں اس دور میں شمالی ہند کے کسی شاعر کا کبھی گزر نہیں ہوا تھا۔ اور وہ بالکل تنہا اپنے ہی ماحول میں اپنی فکری پرواز کو قائم رکھے ہوئے تھا۔ اسی سے لطیف کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

بحیثیتِ مجموعی تیرھویں صدی کے شعراء کے پاس جو خیالات ملتے ہیں وہی خیالات و افکار لطیف کے ہاں بھی موجود ہیں۔ خصوصیت سے اخلاقی انحطاط سماج کے غلط رسم و رواج، اہلِ دولت اور امراء کی تعیش پسندی، نوجوانوں کی بے راہ روی، غرور و تکبّر سے بے زاری، دنیا کی مکاری کی بہترین عکاسی لطیف نے اپنے کلام میں کی ہے۔ انگریزوں اور ٹیپو سلطان کی معرکہ آرائیوں کے مبہم اشارے اور ٹیپو سلطان کو انگریزوں کی ختم کرنے کی وہ سازشیں جو مقامی راجاؤں

اور نوابوں کے ساتھ مل کر کی گئی تھیں ان کا ذکر اشاروں اور کنایوں میں بڑے لطیف اور طنز و مزاح کے انداز میں کیا ہے۔

لطیفؔ کی شہرت اور عظمت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس نے اپنے دور کے عام لوگوں کے احساسات کی ترجمانی ان کی ہی اپنی زبان میں کی ہے اور لطیفؔ غزل کا شاعر ہونے کے باوجود اس نے اکثر و بیشتر غزل کے فارم کو نظم کی طرح استعمال کیا اور اس استعمال میں ایک حد تک زیادتی برتتے ہوئے غزل کے اطراف جو نزاکت کا ہالہ بنا ہوا تھا اُسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا مگر اس توڑ پھوڑ کے باوجود لطیفؔ کی غزل ہزل نہیں بنی جس کا اردو میں رواج رہا ہے۔ یہی لطیفؔ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

لطیفؔ ویسے بھی ٹمل ناڈو کا وہ واحد خوش قسمت شاعر ہے جس کی وفات کے ایک سو سال بعد بھی اس کی تلاش و جستجو کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور اس کی شعری لطافتوں کی روشنی تمام ذہنی گوشوں میں اپنی بھرپور رنگینیوں کے ساتھ موجود ہے۔

لطف سے حق کے جو تو صاحبِ دیوان بنا ... کیوں نہ باقی رہے دنیا میں ترا نام لطیفؔ

لطیفؔ کا انتقال 1876ء میں بمقام آرکاٹ ہوا اور اسد پور میں تدفین عمل میں آئی۔ آج بھی لطیفؔ کا مزار مشہور بزرگ ولیِ کامل حضرت ٹیپو اولیاءؒ کے روضہ کے قریبی احاطہ میں منوّر و معطّر ہے۔ ؎[1]

اک قبر فقط مری منوّر ہے نہ سمجھو ... کونین میں ہے شمعِ رسالتؐ کا اُجالا

یہ مقالہ اسلامیہ کالج وانم باڑی کے جشنِ یوم اردو میں پڑھا گیا (۱۹۹۵)

---

[1] مولانا راہی فدائی کی تازہ ترین تحقیق کے مطابق راقم الحروف کو بھی اس مزارِ مبارک پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔



نوابِ تجمّل حسین خان ایمانؔ گوپاموی

نوابِ تجمّل حسین خان ایمانؔ گوپاموی کا تعلق اگرچہ تامل ناڈو سے نہیں تھا، لیکن اُن کے ذہنی نشوونما اور علمی وادبی خط وخال کو اجاگر کرنے میں اسی سرزمین کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ نواب ایمانؔ نے یہیں سے اپنی قابلیت و صلاحیت کا پرچم لہرایا۔ اوران کی شہرت کا سورج بھی تامل ناڈو کے اُفق سے طلوع ہوا۔ نواب ایمانؔ بمقام گوپامو (اترپردیش) 1277ھ م 1860ء میں پیدا ہوئے ان کا سلسلۂ نسب تقریباً چونتیس 34 واسطوں سے خلیفۂ دوم حضرت فاروقِ اعظم تک پہنچتا ہے۔

نواب ایمانؔ کی ابتدائی تعلیم گوپامو میں ہوی اور بقولِ پروفیسر محبوب پاشا (ابنِ ایمانؔ گوپاموی) مولانا محمد اکرم گوپاموی سے فقہ وحدیث مولانا خیرالدین گوپاموی سے تفسیر واصول اور مولانا عبدالحق خیرآبادی سے معقولات کی سندیں حاصل کیں۔ [1]

[1] (قصائد ایمان)

نواب ایمانؔ کا خاندان نواب انورالدینؒ خان کے زمانہ میں مدراس آچکا تھا۔ نواب انورالدین خان جو مضافاتِ لکھنؤ کے ایک قریہ گوپاموکے رہنے والے تھے کرناٹک (آرکاٹ) کی صوبہ داری کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد نواب انورالدین خان ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پھر اُن کی قدردانی حوصلہ افزائی اور اقربا پروری کی وجہ سے ان کے خاندان کا ہر فرد مدراس کا رُخ کرنے لگا اور تقریباً ایک صدی تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی نواب ایمانؔ گوپاموی تھے۔

نواب ایمانؔ کے والد حافظ ولی احمد کے انتقال کے بعد ایمانؔ سولہ سال کی عمر میں اپنی والدہ نیاز فاطمہ کے ساتھ حیدرآباد ہوتے ہوئے 1297ھ میں اپنے چچا رفعت الملک بہادر (دامادِ نواب عظیم جاہ بہادر، پرنس آف آرکاٹ) کے پاس مدراس آئے۔ نوابینِ آرکاٹ کا یہ وہ سنہری دور تھا جب کہ شمالی ہند سے اہلِ علم وفن، اربابِ ادب، نکتہ رس و نکتہ دان اور سربرآوردہ علمائے وقت نوابینِ آرکاٹ کے دربار کی طرف کھنچ کر آرہے تھے۔ نوابینِ آرکاٹ کی علم دوستی اور قدردانی کا یہ عالم تھا کہ اہلِ علم وفن کے لیے اپنے بیش بہا خزانے لٹائے جا رہے تھے۔ مولانا ابوالجلال ندوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اہلِ علم جب مدراس کی طرف رجوع کرتے تو شمال کے اربابِ علم وفن سے خاص طور پر یہ تاکید فرماتے تھے کہ "مدراس جانے کے بعد اپنی زبان پر قابو رکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں کے اہل علم کے آگے ہمارا بھرم کھل جائے"۔

مدراس آنے کے بعد ایمانؔ نے اپنے چچا نواب رفعت الملک بہادر سے

؏ موصوف حضرت شاہ ولی اللہ میراں قادری رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۱۵۷ھ کے خاص مرید تھے۔

ملاقات کی۔ نواب رفعت الملک نے بڑے چاؤ، محبت اور خلوص سے ان کی سرپرستی قبول فرمائی۔ چناں چہ ایمانؔ نے مدراس آنے کے بعد اپنے وقت کے جیّد علماء اہلِ نظر، اہلِ دل حضرات مثلاً طرازش خان، مولوی غلام دستگیر بہتؔ اور مولانا الحاج عبدالوہاب (بانیٔ مدرسہ باقیات صالحات) سے بھرپور استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ ان حضرات کی صحبتوں سے فیض یاب بھی ہوئے۔ مولانا ایمان نے مولانا الحاج عبدالوہاب کے دستِ مبارک پر بیعت سے مشرف ہوتے ہوئے خلافت کی روشن منزل بھی طے کی۔

مولانا ایمانؔ کی علمی، ادبی اور دینی قابلیت سے بے حد متاثر ہوکر نواب انتظام الملک بہادر پرنس آف آرکاٹ، سوم نے اپنی چوتھی صاحبزادی سے ان کا بیاہ کیا۔ اس وقت ایمانؔ کی عمر تیئیس[23] سال تھی۔ نواب انتظام الملک کی دامادی کا یہ اثر ہوا کہ ایمانؔ نہایت یکسوئی اور طمانیتِ قلب کے ساتھ علمی اور ادبی خدمات کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ ایمانؔ کی ہستی ہر اعتبار سے جامع الصفات تھی۔ مختلف علوم پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے مدراس کے ادبی اور علمی ماحول میں اُن کا مقام بہت بلند تھا۔ اُس وقت کے جلیل القدر علماء ایمانؔ کی استعداد، تبحّرِ علمی، ذہانت وفطانت اور اخلاق واوصاف کے دل سے معترف ہی نہیں تھے بلکہ ایمانؔ کا خاص احترام بھی کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سید ضامن علی جلالؔ لکھنوی کا سارے ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا۔ شعراء جلالؔ لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اس دور میں جلالؔ کی زباں دانی، نکتہ رسی اور فن وادب پہ بھرپور دسترس مُسلّم تھی۔ ایمانؔ کو چونکہ بچپن ہی سے شاعری سے فطری تعلق تھا۔ رفتہ رفتہ ایمان کے شعری جوہر اجاگر ہونے لگے اوروں کی طرح ایمانؔ نے بھی اصلاحِ سخن کے لیے حضرت جلالؔ لکھنوی کو منتخب

کیا۔ ابتداء میں خط وکتابت کے ذریعہ اصلاح کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایمان نے کئی مرتبہ بالمشافہ لکھنؤ اور رام پور جا کر استاد کی خدمت میں حاضری دی۔

ایمان کی شاعری کا مقام بہ اعتبارِ زبان وفن بہت اونچا ہے۔ ان کی تخلیقات کے غائر مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان نے شعوری طور پہ جلال و داغ کے لہجہ کا بیک وقت اثر قبول کیا ہے۔ ایمان کے ہاں رعایت لفظی ، صنائع بدائع اور محاورات کا صحیح استعمال ملتا ہے۔ ایمان کا فکری سفر گنجلک اور بعید از قیاس راستوں میں گم نہیں ہوتا بلکہ ایک متوازن فضا میں جاری رہتا ہے۔ ایمان نے مختلف اصناف سخن پہ طبع آزمائی کی ہے۔ ہر صنف میں ان کی صلاحیت واستعداد کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ایمان چوں کہ ایک جید عالم، شیوہ بیان مقرر اور السنۂ مشرقیہ کے ماہر تھے ان کی تخلیقات میں تغزل کی لطافت کے ساتھ ساتھ فکر ونظر اور شدتِ احساس کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی نگارشات سے ایک دور کو متاثر کیا۔ بعض شعراء کی ایمان سے معاصرانہ چشمکیں بھی ہوتی تھیں لیکن یہ چشمکیں کسی ذاتی منافرت اور ذاتی عناد کی بنا پہ نہیں ہوتی تھیں بلکہ تہذیب وشائستگی کی فضا میں اربابِ علم وفن کو غور وفکر کا سامان مہیا کرتی تھیں۔ ایمان کا حلقۂ تلامذہ بھی نہایت وسیع تھا۔

ایمان معاشی ضروریات سے بالکل بے نیاز تھے۔ انتظام الملک بہادر کی صاحبزادی سے شادی کرنے کے بعد انہیں خوب آسودگی کے دن نصیب ہوئے۔ عام طور پہ آسائش وفراغت کے ایام میں انسانی ذہن جبلی طور پہ غلط راستوں میں بھٹک جاتا ہے۔ نفس کی تسکین اور طمانیت قلب کے لیے انسان ایک ایسا ماحول پیدا کر لیتا ہے جہاں آسائش کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں نے شاعری کو بھی ذہنی عیاشی کہا ہے، لیکن راقم کا خیال ہے ہر زبان کی تاریخ میں

شاعری کے تعلق سے کچھ ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ شاعر نے قوموں کی تقدیر بدلی ہیں اپنی زبان اور قلم سے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ ایماںؔ آسودہ حال ضرور تھے لیکن حبّ رسولؐ اور آلِ سیّد لولاکؐ سے ان کی دلی وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ اُن کے ذکر سے ایماںؔ پہ رقّت انگیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایماںؔ نے اپنے وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر غزل کا بھی پورا پورا حق ادا کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو گیا تو ان کی تمام تر توجّہ نعت گوئی کی طرف مبذول ہو گئی۔

ایماںؔ اخلاقی اعتبار سے درویش صفت اور فقیر مشرب تھے۔ تبحّرِ علمی کے باوجود ایماںؔ کی انا کبھی نخوت سے ملّوث نہیں ہوی۔ طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ تواضع، وضعداری اور خوش اخلاقی کی خصوصیات ان کی طبیعت میں اس طرح مجتمع تھیں کہ ملنے والا دل سے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

ایماںؔ نے بہت طویل عمر پائی تھی۔ انہوں نے بیاسی سال کی عمر میں (1359ھ م 1940ء) میں وفات پائی اور مسجدِ والاجاہی کے صحن میں سپردِ خاک کئے گئے۔

کلام کا نمونہ

نعت

نعتِ احمدؐ سے طبیعت جو لڑی رہتی ہے — سامنے فوج مضامین کی کھڑی رہتی ہے

بڑھ کے بخشش تری لیتی ہے گنہگاروں کو — بے گناہی ہے کہ مایوس کھڑی رہتی ہے

سہل کر دیتے ہیں جس شخص کی مشکل کو حضورؐ — پھر اُسے کوئی نہ سختی نہ کڑی رہتی ہے

زندہ پہنچوں گا مدینہ کو بسِ مرگ ایماں — رات دن مجھ کو یہی فکر بڑی رہتی ہے

عشقِ رسول پاکؐ نہیں ہے تو کچھ نہیں
دل ہجرِ شہؐ میں چاک نہیں ہے تو کچھ نہیں

ناخوش حضورؐ ہوں گے جو طاعت میں ہو قصور
اتنی بھی دل میں دھاک نہیں ہے تو کچھ نہیں

نادم گنہ سے ہو تو ہے رحمت کی کچھ اُمید
اور خوف و بیم و باک نہیں ہے تو کچھ نہیں

●

بڑی خوشی تو اُسی روز کی خوشی ہوگی
کہ ہم کو دید میسّر رسولؐ کی ہوگی

جو ہجر شہؐ میں بسر ہو رہی ہے رو دھو کر
وہ کہیے کیسی مصیبت کی زندگی ہوگی

مرے کریم جو تو بخش دے گا ایمانؔ کو
ترے خزانۂ رحمت میں کیا کمی ہوگی

●

غزلیں

زباں پہ اُن کی مرا ذکرِ خیر اکثر تھا
مگر یہی کہ وہ کم بخت بانیٔ شر تھا

ہر ایک عشق میں میرے لیے ستمگر تھا
فلک تھا، آپ تھے، دل تھا، مقدر تھا

شبِ فراق اٹھاتے پے دُعا کیوں کر
کہ ایک ہاتھ جگر پہ تھا، ایک دل پہ تھا

●

ترے دیوانے ہوں کیا خاک دست انداز دامن پہ
کہاں سے لائیں دامن، پیرہن ہی جب نہیں تن پہ

وہ نالے مکبلِ ناشاد کر شاخِ نشیمن پہ
گلوں کا دل بھڑک جائے تری فریاد و شیون پہ

نہ کامل نکتہ دانوں میں، نہ شامل خوش بیانوں میں
تجھے ایمانؔ پھر کس علم پہ ہے ناز کس فن پہ

●

وسعت مرے دل میں نہیں ارمان بہت ہیں
مشکل ہے کہ گھر تنگ ہے، مہمان بہت ہیں

ساقی ترے شیشوں سے فزوں دل ہیں شکستہ
پیمانوں سے ٹوٹے ہوئے پیمان بہت ہیں

دشوار ترے عشق میں نکلی وہیں باتیں!
ہم جن کو سمجھتے تھے کہ آسان بہت ہیں

ایمانؔ کدھر دیکھتے ہو، دھیان ہے کس کا
کیا وجہ ہے نظریں جو پریشان بہت ہیں

●

وہ تو جھلک دکھا کے پس پردہ ہٹ گئے
ہم بے خودی میں دوڑ کے پٹ سے لپٹ گئے

خنجر بکف گزر گئے اپنی گلی سے تم
کچھ یہ بھی ہے خبر کہ گلے کتنے کٹ گئے

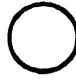
جتنے تعلقات تھے آخر کو عشق میں
کچھ ہم نے قطع کر دیے کچھ خود ہی کٹ گئے

کعبہ میں شیخ، دیر میں ہم، میکدہ میں رند
سب اپنی اپنی دھن میں ترا نام رٹے گئے

ایمانؔ بعدِ مرگ جو مٹی بتوں نے دی
دل کے گڑھے بھی گور کے ساتھ اپنے پٹ گئے

●

مطبوعہ ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد ۱۹۹۱ء



مولانا عبدالحئی اختر بنگلوری

دکن اور اردو کا رشتہ اس قدر قدیم اور مسلّم ہے کہ اس کے ثبوت کے لیے تاریخی حوالہ جات کی آج کل ضرورت نہیں محسوس ہوتی ہے۔ اس موضوع پہ تاریخ ادبِ اردو کے بیشتر محققین اپنی پوری ذہنی توانائی اور روشنائی خشک کر چکے ہیں۔ تاہم قندِ مکرّر کے طور پہ کچھ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا۔

سلطان علاؤالدین خلجی (1296ء تا 1316ء) کے مشہور سپہ سالار ملک کافور نے 1309ء میں سب سے پہلے کرناٹک فتح کیا اور علاؤالدین کی وفات (1317ء) کے بعد دوبارہ محمد بن تغلق نے 1361ء میں کرناٹک پہ فتح و کامرانی حاصل کی تو اس کے فوجیوں کے ہمراہ مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی سیاسی تجارتی اور لشکری مقاصد کے تحت شمالی ہند سے کرناٹک میں داخل ہوی۔ اس دور میں شمال اور کرناٹک کے تعلقات میں بہت وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی گئی۔ (بالخصوص 1400ء میں جب کہ سلطان فیروز شاہ بہمنی نے وجیانگر کی شہزادی سے بیاہ

لالہ مہتاب رائے[1] سبقت اور محمد مخدوم شاکر وغیرہم نے اردو کے شعری سرمایہ میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت بھی کی ۔ ان شعراء میں چند ایک میدانِ طریقت کے شہ سوار بھی تھے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شمالی ہند میں آبرو (المتوفی 1733ء) فائز دہلوی (المتوفی 1738ء) اور خان آرزو (المتوفی 1756ء) کا دور ختم ہو چکا تھا اور حاتم (المتوفی 1783ء) میر درد (المتوفی 1784ء) مرزا رفیع سودا (المتوفی 1798ء) اور قلندر بخش جرأت (المتوفی 1809ء) کا اردو شعر وادب میں بہت شہرہ تھا ۔ اس کی شہادتیں ہمیں اس دور کے لکھے ہوئے تذکروں میں ملتی ہیں۔

دورِ ٹیپو سلطان (1782ء تا 1799ء) میں زین العابدین[2] (میر منشی ٹیپو سلطان) حسن علی عزت[3]، سید عارف شاہ قادری[4]، میر حسن علی کرمانی حاکم[5]، شاہ کمال الدین کمال[6]، محمد علی جھکری خانہ زاد[7]، محمد اسحاق اور عبدالحق[8] جیسے شعراء، ادباء، اہل علم اور اصحاب فضل نے اپنی تصنیفات اور تالیفات کے ذریعہ اردو شعر وادب کے ایک چھوٹے علاقے کے حدودِ اربعہ کو خاطر خواہ وسعت

---

[1] مصنف بڑی چہار کرسی ۔ [2] 'مہتاب سخن' (فارسی) 'شمع مجلس' (اردو) [3] مصنف تحفۃ المجاہدین 1781ء [4] مؤلف 'مفرح القلوب' جس میں موسیقی کے قواعد دکھائے گئے ہیں ۔ [5] مصنف مثنوی "حقوق المسلمین 1224ھ" ٹیپو سلطان کے حکم پر رسالہ "احکام النکاح" بھی ترتیب دی۔

[5] مصنف "نشانِ حیدری"۔ [6] "مخزن العرفان" 1913ء [7] مصنف "گنج شائگان" 1806ء۔ [8] مصنف "ریاض العارفین" سنہ 1276ھ [9] مصنف "چھوٹی چار کرسی"۔

یہ مثنوی شگفتہ بحر صاف اور سادہ دکنی زبان میں بچوں کے لیے لکھی گئی ہے ۔ آج بھی اکثر گھروں میں ہر جمعرات کو بعد نماز مغرب عورتیں بصد احترام ترنم سے پڑھتی ہیں۔

رچاکر دو سلطنتوں کے درمیان تعلقات استوار ہی نہیں کیئے بلکہ وجیا نگر کی قلمرو نے مسلمانوں کو ملازمتیں بھی دیں۔) جس کی وجہ سے اردو زبان کے بولنے والے کرناٹک کے مختلف مقامات پر پھیلتے چلے گئے۔

1490ء۔ 1686ء کے دوران بیجاپور میں عادل شاہی اور 1508ء 1687ء کے دوران گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومتیں قائم رہیں۔ 1565ء تالی کوٹ کی جنگ کے بعد علاقۂ کرناٹک میں مسلمان حکومتیں پہلے کی بہ نسبت اپنا اثر و نفوذ اور زیادہ مستحکم کرنے لگیں ــــ مسلمانوں کے مذہب، تہذیب اور تمدن کے ساتھ ساتھ اردو زبان کرناٹک کے دُور دراز علاقوں میں پھلنے پھولنے لگی۔ اس عام رجحان اور ان عمومی اثرات سے میسور کا علاقہ مستثنٰی نہیں تھا۔ چناں چہ 1761ء میں سلطنت خداداد کے قیام سے پہلے کرناٹک کے شعراء ادباء اور علماء نے اردو زبان کی ترقی اور نشو و نما میں بطورِ خاص توجہ دی۔ جن میں شمالی ہند، ترکستان، ایران اور عرب کے اہلِ علم و کمال کے علاوہ خود کرناٹک میں ملک الشعراء نصرتی بیجاپوری، ہاشمی بیجاپوری، عبدالمومن[1] مومن (عادل شاہی دور کا آخری شاعر) اور شاہ محمد صدرالدین[2] فرزندِ میراں شاہ ولی اللہ (المتوفی 1146ھ مدفون آدم پہاڑی، ضلع شمالی آرکاٹ) قابلِ ذکر ہیں۔

قیام سلطنتِ خداداد کے بعد عہدِ حیدری (1761ء تا 1782ء) میں محمد سعید عاصی المتوفی 1753ء، سید محمد شاہ میر المتوفی 1189ھ، خیر اللہ شاہ[3] قادری خادم، فضل اللہ[4] فقیر، سید حسین علی شہباز، احمد خان شیرانی

[1] مصنف مثنوی "اسرارِ عشق" (1682ء م 1093ھ) تاریخ ادب اردو" ڈاکٹر جمیل جالبی۔
[2] مصنف مصباح النور (نظم) "شرح مصباح النور" (نثر)۔ [3] مصنفِ "انتباہ الطالبین"
[4] مصنف "چہار کرسی طریقت"۔

بخشی ۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا زمانہ بہت مختصر سہی پھر بھی اس عہد میں اردو زبان کے شعر و ادب اور علم و فن کی سرپرستی اور قدر دانی بہت زیادہ ہوئی ۔ حالاں کہ اس عہد کی دفتری زبان فارسی تھی لیکن ٹیپو سلطان کی جامع الصفات اور علم دوست شخصیت کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ موصوف نے اپنے دور میں مذہبی تعلیم کے ساتھ دوسرے بہت سارے علوم و فنون مثلاً فلسفہ، ریاضی، نجوم، طب کی تعلیم و تدریس کے لیے سری رنگپٹن میں "جمیع الامور" نامی درس گاہ قائم کی ۔ سلطان کو مختلف علوم و فنون پر کافی دست گاہ حاصل تھی اور تصنیف و تالیف سے بہت گہرا لگاؤ تھا ۔ لہذا موصوف نے کرناٹک کے مسلم حکمرانوں کی طرح راجگانِ میسور نے بھی اردو زبان کی بھرپور سرپرستی کی ۔ چناں چہ ٹیپو سلطان کی شہادت 1799ء کے بعد مہاراجہ کرشناراج ووڈیار اور اس کے متبنیٰ چامراج وڈیار (تخت نشینی 1868ء) کے عہد میں بھی اردو کی ہر دل عزیزی اوج پر تھی ۔ اس دور کے معروف ادبا و شعرا میں میر حیات[1] میسوری (وفات 1864ء) سید عبداللطیف لطیف[2] آرکاٹی (وفات 1876ء)، محمد قاسم غم[3] (وفات 1861ء)، محمد حسین نسیم[4] (وفات 1888ء)، محمد عبدالرحمٰن دل[5] (وفات 1899ء)، عبدالحق تحقیق[6] (وفات 1900ء)، عبدالحفیظ آرام[7] (وفات ......ء)، سید شہاب الدین شہاب[8] (وفات 1905ء)

---

[1] مصنف "مصباح الحیات" 1870ء، "خمسۂ حیات" 1861ء، "شمع محفل" "تعلیم نسوان"

[2] دیوانِ لطیف، سنہ ء [3] مصنف "مثنوی غم" مطبوعہ 1853ء، مدیر "قاسم الاخبار" 1861ء یہ میسور کا پہلا اردو اخبار تھا جس کے تیس[20] سے زیادہ شمارے منظرِ عام پر آئے ۔ [4] "دیوانِ نسیم" غزلوں کا مجموعہ ہے لیکن مثنوی اور نثری تحریریں جس سے نسیم کی شخصیت اور فن کے نمایاں خدوخال اُجاگر ہوتے ہیں آج تک کتابی صورت نہ دیکھ سکے ۔ اگر نسیم کی معرکتہ الآرا تخلیقات منظرِ عام پر آجائیں تو نسیم کے مقام کے تعین میں بہت آسانی ہو گی۔ [6] مدیر "شمع سخن" 1884ء ۔ [5] مدیر "ترغیب" 1889ء رسالہ "نسوان"، [8] مولانا شہاب ویلور میں پیدا ہوئے ۔ مولوی غلام قادر مدراسی کی خانقاہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔ مولانا قطبِ ویلور سے بیعت و خلافت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

محمد غوث جادو[1] (وفات 1907ء)، بڈھن شریف آثم[2] (وفات 1918ء) منشی قلندر حسین اطہر[3]، مولانا عبدالقادر علی صوفی[4] (وفات 1956ء) فرزندِ مولانا عبدالحق احقر بنگلوری) عبداللہ مستان[5] (وفات 1913ء) اور مولانا شاہ عبدالحی احقر بنگلوری (وفات 1882ء) قابلِ ذکر ہیں۔ ——— مگر ان سب میں علم و فضل اور شرف و کمال کے اعتبار سے جو مقام و منزلت حضرت مولانا عبدالحیٔ احقر بنگلوری کو حاصل ہے وہ کسی اور کے مقدر میں نہیں۔ درحقیقت حضرت احقر نے مختلف علوم و فنون بالخصوص اردو زبان وادب کی اشاعت و ترویج میں اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ صرف کر دیا۔ آپ ہی کی واحد ذات تھی جس کی بدولت اسلامیات کا بہت زیادہ ذخیرہ اردو نظم و نثر میں منتقل ہوا۔ یہ تاریخ کی ایک ستم ظریفی ہے کہ بعض اوقات مصنف کی اپنی تصنیفات اس قدر مشہور ہو جاتی ہیں کہ ان کی روشنی کے آگے قاری کو صاحبِ تصنیف کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ مولانا عبدالحیٔ احقر بنگلوری کے ساتھ بھی پیش آیا۔ آپ کثیر التصانیف شاعر و ادیب ہونے کے باوجود آپ کی زندگی کے مفصّل حالات اور فن و شخصیت کے بسیط نورانی خدوخال آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتے

ص کا بقیہ حاشیہ:۔ کی منوّر منزلیں طے کیں۔ قطبِ ویلور کی مشہور کتاب "جواہر الحقائق" پر آپ نے مقدمہ لکھا ہے۔ آپ کے مریدین کی خاصی تعداد جنوبی ہند میں پھیلی ہوئی ہے۔

[1] مصنف "کلام جادو" 1335ھ [2] مصنف "فوائد الاسلام"، "شہادت نامہ"، "رسول مقبول" اور "میزان المنطق" [3] "جنان السیر" پر موصوف کا مقدمہ موجود ہے جس سے اطہر کی بہترین نثری صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ [4] اپنے وقت کے جیّد عالم و فاضل تھے۔ [5] مستان قطبِ ویلور کے غائبانہ مرید تھے۔ اور اپنی تالیف "گلشنِ رحمانی" 1892ء میں موصوف نے اپنے پیر و مرشد سید شاہ عبداللطیف قادری قطبِ ویلور کا ذکر نہایت احترام و خلوص کے ساتھ کیا ہے۔

جارہے ہیں۔حالاں کہ آپ اپنے دور کے شعلہ بیان مقرّر، معتبر مفسّر، مستند محدّث قابلِ فخر مورّخ، صاحبِ طرز سوانح نگار اور مقبول ترین انشاء پرداز بھی تھے۔آپ کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشنی میں لانے کا شرف میسور کے ممتاز و منفرد محقق مولانا مولوی ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی صاحب کو حاصل ہے۔آپ نے حضرت شاہ عبدالحیُ الحسینی لکھنوی (پیدائش 1671ء وفات 1685ء) مصنف "نزہتہ الخواطر" کے بارے میں نہایت وقیع اور پُر از معلومات تحقیقاتی کام سرانجام دیا ہے۔اُسی طرح شاہ عبدالحیُ احقر بنگلوری پر بھی بڑی عرق ریزی جانفشانی اور ژرف نگاہی کا بیّن ثبوت فراہم کرتے ہوئے تحقیق اور تالیف کا بھرپور حق ادا کیا ہے۔تاہم کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی، اس میں بہت کچھ اضافوں اور گنجائشوں کو نئی راہیں ملتی رہتی ہیں اس لیے راقم الحروف نے بھی مولانا عبدالحیُ احقرؔ (واعظ بنگلوری) پر ایک تحقیقی نظر ڈالنے کی جسارت کی ہے۔

سلطنتِ خداداد کی تباہی کے بعد انگریزوں کا ظلم و ستم عروج پر پہنچا تو کئی معزّز مسلم خاندان اس کی زد میں آئے۔حضرت مولانا احقرؔ بنگلوری کے آباو اجداد مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے دور سے سلطنتِ خداداد تک بہت اہم اور اعلیٰ منصبوں پر فائز تھے۔آپ کے والد ابراھیم بیگ ترکیرا (Terikira) کے عمل دار تھے۔دادا گلان درگ کے آصف، پردادا قادر علی بیگ اعظم پور کے عملدار تھے۔حضرتِ احقرؔ کی والدہ کا سلسلۂ نسب سات گڈھ بمقام بیاری بیگم پیٹ[1] شمالی آرکاٹ کے مشہور صوفی بزرگ شاہ آدم تک پہنچتا ہے۔آپ کے والد زوالِ سلطنتِ خداداد کے بعد اپنے فوجی منصب سے

---

[1] پیاری بیگم پیٹ اب پیر نام پیٹ کے نام سے منسوب ہے۔

معزدل ہوکر اپنے سسرال بنگلور آئے، جہاں حضرت احقر کی ولادت 1234ھ میں ہوی۔ بچپن ہی سے آپ کا ماحول دینی اور علمی تھا۔ آپ نے اپنے والدین سے جہاں دادھیال کی بہادری، شجاعت اور جواں مردی کے سنہرے واقعات سُنے وہاں نانیہال کے صوفیانہ رنگ ڈھنگ، تقویٰ اور پرہیزگاری سے آگاہی حاصل کی۔ اس لیے عہدِ طفلی ہی سے آپ میں ہمّت اور دلیری کے ساتھ علم وعرفان، زہد وتقویٰ، جذبۂ دین داری اور حمیّتِ اسلامی رچی بسی ہوی تھی۔ چناں چہ آپ کی تمام تر تخلیقات میں اس کی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر ہی ہوی۔ بعد میں آپ بنگلور کے ایک مشہور عالم باعمل حضرت سید شاہ سجّاد شطّاری کے دامنِ تلمذ سے وابستہ ہوے۔ موصوف کے دامانِ تربیت میں آپ کی شخصیت کے نقوش خوب نکھرے اور یہیں سے آپ کو علوم وفنون کا صحیح ذوقِ عطا ہوا۔ جب آپ نے بنگلور میں رہ کر علوم ظاہری سے فراغت حاصل کر لی تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ویلور (ضلع شمالی آرکاٹ) کا رخ کیا۔ اس دور میں ویلور میں حضرت سیّد شاہ محی الدین عبداللطیف قادری (المتوفی 1289ھ) کی ذاتِ اقدس علم وعرفان کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، تشنگانِ علوم وفنون کے لیے آپ کی خانقاہ چشمہ نورانی کی حیثیت رکھتی تھی۔ حضرت عبدالحی[1] احقر بنگلوری جب حضرت قطبِ ویلور کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہوگئے تو شیخ کامل قطب ویلور کی نگاہِ دُور بین نے اس نوجوان، ہونہار اور قابل طالب علم کے باطن میں پوشیدہ جوہرِ نایاب کا سراغ لگایا اور احقر بنگلوری کا ذوقِ معرفت اور اشتیاق

---

[1] حضرت عبدالحیٰ کا نام ماں باپ نے "بڈھن بیگ" رکھا تھا۔ مگر قطب ویلور نے آپ کا نام عبدالحیٰ تجویز کیا۔

وطلبِ راہِ حقیقت آہستہ آہستہ رنگ لائی، جس کا اظہار بڑی والہانہ عقیدت کے ساتھ یوں کیا ہے ؎

خصوصاً شیخ میرا قطبِ اشہر | یقیں اس عصر کا ہے شیخ اکبر
یقیں ایسے ہیں اخلاقِ جمیلہ | ہیں بے حد اس کے اوصافِ جمیلہ
سمجھ عبد اللطیف اس کا ہے نام | لقب ہے محی الدین لئے نیک انجام
ہے وہ فرزند سید ابوالحسن کا | ہے پوتا محی الدین قطبِ زمن کا

(سر الشہادتین: مطبوعہ 302 اھ)

"جنان السیر" کے دوسرے چمن میں فرماتے ہیں: ؎

خاص کر شیخ مرا قطبِ زماں | شیخ فیاض ہے در سر و عیاں
شہرِ ویلور سے لے تا بعرب | مستفیض ہیں اس ایک عالم اب
ہر جگہ اس کے فیوض وارشاد | شرک والحاد کی توڑے بنیاد
علمِ ظاہر میں ہے مدقق فاضل | علمِ باطن میں محققِ کامل
عالم و حافظِ قرآنِ کریم | عارف و سالک و فرزانہ حکیم
چرخِ عرفاں کا ہے بدرِ منیر | ملکِ وجدان کا ہے شیخِ کبیر
بالیقیں جس کا مقدس سینہ | ہے حقائق کا عجب گنجینہ
عارفِ عصر ہے ایسا ذی شاں | خوشہ چیں جس کے ہیں عرفائے زماں
ہے نسب میں وہ حسینی ز پدر | اور حسنی ہے ز سوئے مادر
باصفا عبد اللطیف اس کا نام | محی الدین ہے ملقب وہ ہمام
بوالحسن والدِ امجد اس کا | محی الدین قطبِ زمن جد اس کا

دیدہ گاہ اس کو رکھے ربِّ انام
مہتدی اس کے مریدوں کو تمام

"چہار گلشن" بھی مولانا کی اہم ترین تصنیف ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے شیخ کی مدح سرائی یوں کی ہے۔ ؎

شکر للہ دریں زمانِ آخیر | فرد ایسا ہے ایک میرا پیر
شیخ الشیاخ سید السادات | ذوالکمالات منبع برکات
مجمع سیرتِ حسینؓ و حسنؓ | خلف بوالحسن شہید امن
علمِ ظاہر میں فارغ التحصیل | علمِ باطن میں صاحبِ تکمیل
جامعِ علم ظاہر و باطن | معدنِ فیض یار زدکامن
ہے شریعت میں عالم و عامل | اور طریقت میں واصل موصل
[illegible] ولیو رسے جو ہے مشہور | ذات اس کی ہے ایک منبع نور
ایک عالم مرید ہیں اس کے | علم باطن اسی سے ہیں سیکھے
معتقد اس کے ہیں خواص و عوام | کیا امیر و فقیر یا اکرام
موشگافی ہے اس کو عرفاں میں | نکتہ یابی کمال وجداں میں
سرّ و ظاہر میں ہے غرض یکتا | پیشوا ہے وہ دین و ملّت کا
ہے حمایت میں دیں کے سرّ و عیاں | محی الدین ہے اُسے لقب شایاں
زہد و تقویٰ میں اور توکّل میں | جُود و بخشش میں اور تبذّل میں
حق نے بخشی ہے اس کو شانِ جلیل | کوی اس عصر میں نہ اس کا عدیل
ذکرِ مولا میں صبح سے تا شام | ہے اُسے اطمینان اور آرام
دائماً اس کی محفلِ پُر نور | ذکرِ مولا سے ہے یقیں معمور
جب تلک بیٹھیں اس کی محفل میں | خوفِ حق تب تلک رہے دل میں
ذکرِ مولا سے دل کو اُنسیت ہو | اُنسیت وجہیں اور لذّت ہو
بیشتر اس کی محفلِ انور ! | ذکرِ دنیا سے دُور رہے اشہر

اس کی محفل ہے مور دِ رحمت — اس کی صحبت ہے دافِعِ غفلت
اس کی مجلس دلا دے یادِ خدا — اس کی صحبت دکھا دے راہِ خدا
اس کی صحبت ہے کیمیا تاثیر — زر کرے مس کو پل میں بے تاخیر

یا الٰہی اُسے سلامت رکھ!
اُس کو فیاض تا قیامت رکھ

اقطابِ ویلور کے فیوض وبرکات سے متعلق فرماتے ہیں:۔

جودتِ طبع تھی اس کی رسا — اور تھا تیز اس کا فہم و ذکا
ہوا مائل مطالعہ کی طرف — تھوڑی مدت میں ہی وہ کانِ شرف
عربی معتبر کتب پہ تمام — ہوا حاوی بفضلِ ربِّ انام
سب پہ قادر کیا اُسے قادر — ہوا ہر فن میں وہ بڑا ماہر
اور تصوف کے سب رموزِ دقیق — اپنے والد سے کر چکا تحقیق!
ہوا یکتا دلیل وبرہاں میں — اور کشف وشہود وعرفاں میں
اس کا کوئی سمجھ عدیل نہ تھا — کوئی اس ملک میں مثیل نہ تھا
بس اسی فن میں وہ گرامی تھا — ثانیٔ جامی و نظامی تھا

یہ نہیں ہے مبالغہ اے یار
واقعی ہے یہ بات بے تکرار

مولانا احقر بنگلوری بہ فیضِ قطبِ ویلور نہ صرف اپنے دور کے عالم با عمل، صوفیٔ باصفا بنے بلکہ دل گداز شاعر اور اصلاح پسند ادیب کی حیثیت سے آفاق گیر شہرتوں اور نیک نامی سے سرفراز ہوئے۔ آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوم سیرت "جنان السیر" (جو دس باب میں منقسم ہے) تحریر فرمائی جسے ڈیڑھ سو سال سے آج تک جنوبی ہند بالخصوص کرناٹک اور مدراس

کی اکثر خواتین گھروں اور مجلسوں میں ہر جمعرات بعد نمازِ مغرب پڑھتی ہیں۔ بے نظیر مثنوی (جو اردو زبان میں مثنوی مولانا روم کا نعم البدل ہے۔) یہ نظم بائیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آپ صحیح بخاری شریف کی شرح "فیض الباری" (1292ھ) کے نام سے لکھی جو دس جلدوں پہ محیط ہے۔ یہ کتاب بخاری شریف کی سب سے پہلی اردو شرح ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مولانا احقر کی جو کتابیں عالم شہود پہ آئیں، اُن میں درجِ ذیل اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۔ خطباتِ حرمین[1] ۔ جمعہ کے خطبات کا پہلا مجموعہ ہے جو اردو میں شائع ہوا۔

۲۔ تفسیر الجواہر :۔ مولانا کی منظوم تفسیر ہے۔

۳۔ حدیقۃ الاحباب :۔ خلفائے راشدین کے حالات پہ ایک ضخیم اور مبسوط نثری کتاب ہے۔

۴۔ شرحِ سِرّ الشہادتین :۔ حضرت امام حسینؓ کی سیرت پہ ایک طویل نظم ہے مطبوعہ 1302ھ۔

۵۔ خلاصۃ السیر :۔ اسلامی تاریخ کا خلاصہ ہے

۶۔ روضۃ الابرار :۔ اہلِ بیت کی سیرت و تاریخ پہ مشتمل ہے۔

۷۔ تحفۂ مرغوب :۔ حضرت شیخ عبدالقادرؒ جیلانی کے تعلق سے بڑی معلومات افزا کتاب۔

۸۔ تذکرۃ المجتہدین :۔ ائمۂ فقہ کے حالات پہ مبنی کتاب۔

۹۔ ریاض الازہر :۔ سیرتِ طیبہؐ پہ یہ دوسرا ضخیم مجموعہ ہے جس میں سات

---

[1] مولانا احقر بنگلوری اپنے خطبات کی مقبولیت کی بدولت حضرت واعظ بنگلوری کے نام سے بھی بڑی آفاقی شہرتوں کے مالک تھے مطبوعہ خطبات کی اولیت کا سہرا بھی موصوف کے سر ہے۔

ہزار سے زیادہ ابیات موجود ہیں۔

۱۰۔ نصرۃ التوحید :۔ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود پر تفصیلی بحث اس کتاب میں شامل ہے۔ مطبوعہ 1325ھ

۱۱۔ حقوق الزوجین :۔ معاشرے کے حالات پر یہ ایک وقیع اور رجحان دار نثری کتاب ہے۔

۱۲۔ منہج النبوت :۔ اہمیت نبوت اور اسرارِ نبوت پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۳۔ فوائد قدسیہ :۔ یہ کتاب سید الاولیاء کی منقبت اور سوانح پر مشتمل ہے۔

۱۴۔ مطلع الانوار :۔ مطبوعہ 1290ھ اور

۱۵۔ کلیدِ معرفت :۔ مطبوعہ 1300ھ۔

مندرجۂ بالا کتابوں کے علاوہ حضرت احقر بنگلوری نے اپنے دور کے رجحان، بدعت اور خرافات کی رد میں اور بھی بہت ساری معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کیں جس سے ایک طرف اردو زبان و ادب کا بھلا ہوا تو دوسری طرف مسلم قوم و ملت کی خاطر خواہ اصلاح بھی ہوی۔ کرناٹک سے ہٹ کر بہت پہلے یہی مبارک کام اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ آندھرا پردیش میں حضرت مولانا سید شاہ رحمت اللہ نائب رسول (آستانۂ مبارک رحمت آباد) اور شہر مدراس میں حضرت مولانا باقر آگاہ دیلوری اور نثر میں قاضی بدرالدولہ نے انجام دیا تھا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ مولانا مولوی ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی صاحب کے قول کے مطابق آپ کے تصانیف کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ تحقیق پر کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی اس لیے قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً نہیں کہ اردو ادب اور اسلامیات کی تاریخ میں آج تک

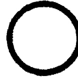
کسی شاعر، ادیب، نقاد، عالم، مفسر کی اتنی کتابیں منظرِ عام پہ جلوہ فروز نہیں ہوی ہوں گی جو معیار کے اعتبار سے بھی اعلیٰ وارفع اور مواد کے اعتبار سے بھی ہر دور کے انسان کے لیے سودمند ثابت ہوں۔ سرزمینِ کرناٹک کی یہ خوش نصیبی ہے کہ حضرت مولانا عبدالحئی احقرؔ بنگلوری کو اس نے جنم دے کر اپنی مانگ میں نورانی اور اَن مٹ سیندور بھر لیا ہے جس کو وقت کی آندھیاں تو کیا کسی ـ نقاد کی سازشیں بھی مٹا نہیں سکتیں۔

حضرت مولانا احقرؔ بنگلوری بنیادی طور پہ ایک اسلامی شاعر تھے۔ علامہ محمد اقبالؒ کی طرح آپ کی شاعری اصلاحی اور نیک مقصدیت سے مملو تھی اردو نثر سے زیادہ اقبالؔ کی طرح آپ کا بھی طبعی میلان نظم کی طرف تھا۔ اقبال کی نظموں کی طرح مولانا احقرؔ کی نظموں میں بھی سلاست، روانی اور اسرار و رموز کی وہ تمام تر جلوہ سامانیاں موجود ہیں، جو اقبالؔ کی شاعری کا نکتۂ عروج سمجھی جاتی ہیں۔ اردو ادب میں مولانائے موصوف کی بلند خیالی، احساس و جذبے کی آئینہ گری، فکر و فن کی آفاقیت ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

من حیث المجموع مولانا احقرؔ بنگلوری کی ذاتِ گرامی کی بدولت جہاں علمی، دینی اور اصلاحی تحریروں کی کرنیں آسمانِ فکروفن منور ہوئے وہاں دکنی اردو کو بھی خاطر خواہ تقویت اور فروغ نصیب ہوا۔ مولانا احقرؔ کی ان احسن خدمات کو اردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی

۳ رجب 300 اھ کو مولانا کعبۃ اللہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوے اور موصوف کے حبِّ رسولؐ اور عشقِ نبویؐ کا کیا کہنا کہ وہ کرناٹک دوبارہ نہ واپس آ سکے۔ وہیں مدینۂ منورہ میں تدفین عمل میں آئی۔ ***

مطبوعہ روزنامہ "پاسبان" بنگلور
1992ء



پروفیسر غلام حسین دلیل مدورئی اور نظمِ "کائنات"

سلطان علاء الدین خلجی کے نامور سپہ سالار ملک کافور نے 709ھ 1309ء میں کرناٹک اور 710ھ 1310ء میں انتہائی جنوب کے علاقوں رامیشورم، کاریکال ناگور اور مدورئی فتح کیا اور اس کے ساتھ ہی شمال سے علمائے دین اور صوفیائے کرام نے بھی دکن کی سرزمین کا رُخ کیا۔ 748ھ 1347ء میں امیرانِ صدہ سے ایک امیر علاؤالدین کو دکن کا بادشاہ منتخب کیا۔ تو اس کا دارالخلافہ گلبرگہ بنا۔ بہمنی دور (1350ء تا 1525ء) کے بعد عادل شاہی (1490ء تا 1685ء) قطب شاہی (1518ء تا 1686ء) اور نظام شاہی ( ) ادوار میں فارسی زبان کے اثرات آہستہ آہستہ دم توڑ کر

ع ۱ تاریخ ادب اردو جلد اول: ص 149 : ڈاکٹر جمیل جالبی

دکنی زبان کے اثرات بڑی سرعت اور توانائی کے ساتھ وسعت وکشادگی پانے لگے۔ اس زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اِسے شاہی اور خانقاہی سرپرستی حاصل رہنے کی وجہ سے زینہ بہ زینہ، منزل بہ منزل ارتقائی سربلندی میسر ہوی۔ شمالی ہند کی زبان اردوئے معلّٰی اور جنوبی ہند کی دکنی زبانیں سب سے زیادہ فرق یہی تھا کہ اردوئے معلّٰی فارسی زبان کے اثرات کے زیر سایہ پروان چڑھتی رہی تو دکنی زبان ہندی کے رنگ وآہنگ اور ہندی مزاج کو بحال رکھتے ہوئے اور مقامی زبانوں کے اثرات قبول کرتے ہوئے جنوبی ہند کے آخری کنارے راس کماری تک کثرت سے بولی جانے لگی۔

ملک کافور کے حملے سے برسوں پہلے ہی سے ہند کے ساحلی مقامات کارومنڈل اور ملیبار پر مالک دینار کی تعمیر کردہ مساجد اور "وحدہٗ لاشریک لہٗ" کی مقدّس صداؤں سے یہاں کی فضائیں منور ومعطر تھیں۔ [1]

اس دوَر میں قرآن وحدیث، فقہ اور دیگر علوم وفنون پر زیادہ توجہ دی گئی اور ہر مقام پر قاضی ومعلّم مقرر کئے گئے۔ عرب تاجر اور مبلغینِ دین کی وجہ سے یہاں کی فضا لازوال روحانی اثرات سے معمور تھی۔ جس کی شہادتیں ابن بطوطہ کے سفرنامے میں بھی موجود ہیں اور بقول فرشتہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے پہلے ہی ملیبار میں سکونت پذیر تھے۔

ملک کافور کے بعد معبر کے صوبہ دار سید جلال الدین احسن شاہ (جو اہلِ نائط سے تھے) نے پانچ سال (1338ء 1330ء) مدورئی پر خود مختار حکومت کی۔

بقیہ صفحہ 88 کا حاشیہ:۔ خواجہ گیسو دراز دہلی سے (سنہ 815ھ م 1412ء) گلبرگہ آئے۔ آپ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مرید وخلیفہ تھے۔

[1] یورپ میں دکنی مخطوطات: ص: 421: مولوی نصیر الدین ہاشمی۔

ملک کافور کے ساتھ شمال سے آنے والی شاہی فوج کے بعض عمائدین نے احسن شاہ کی حکومت کو اپنے مزاج اور فکر کے مطابق پاکر مدورئی ہی کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ احسن شاہ کے بعد علاؤالدین سکندر شاہ ولی، (آخری مسلمان بادشاہ) نے مدورئی پہ چھ سال (1372ء تا 1377ء) تک بادشاہت کی اور یہیں سے دیارن کندرم نامی پہاڑی پہ جام شہادت نوش کیا۔[1] مدورئی میں بسنے والے انہی زعماء[2] میں سے حضرت غلام حسین ذلیل کے آباء و اجداد تھے۔ حضرت ذلیل 16 / مارچ 1895ء کو شہر مدورئی میں قاضی محلّے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت محمد ابراہیم ذائج تجارت پیشہ ہونے کے باوجود فطرتاً صوفی مزاج آدمی تھے۔ آپ پہ ہمیشہ ایک محویت کا عالم طاری رہتا تھا۔ مدورئی میں آپ کے عقیدت مندوں کی کثیر تعداد تھی۔ آپ ملک التجار ہونے کے ساتھ ساتھ فنونِ حرب کے بھی ماہر تھے۔ مدورئی کے عوام میں بھی آپ "ذائج مستان" کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کے اجداد کی طرح ننھیالی سلسلے کے افراد بھی ساداتِ کبار (معززین شیراز (ایران) سے تعلق رکھتے تھے۔

اسی سلسلہ کے ایک بزرگ حضرت سید شاہ جمال الدین، شاہ منگول کے وزیر تھے۔ سید جمال الدین کے جدِّ امجد سید شاہ جمال الدین کے دستِ حق پرست

---

[1] اسی پہاڑی پہ آپ کا مزار مبارک واقع ہے۔

[2] حضرت مولانا عبدالوہاب (المتوفی 1337ء) بانی باقیاتِ صالحات کا سلسلہ نسب بھی انہیں زعمائے ذی وقار شیوخ طریقت سے ہے اس توضیح و تشریح سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ مولانا عبدالوہاب کے حسب و نسب سے متعلق بعض اہل قلم حضرات کو اشتباہ یا تاریخی مغالطہ ہوا ہے کہ درج کے بیان کو عموماً اہل تصنیف نے بغیر کوئی تلاش و تخصص کے نقل کر دیا ہے۔

شاہِ منگول غازی خان نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ عالم اسلام کا انتہائی اہم واقع تھا۔

کشاکشِ حالات اور وقت کی ستم ظریفی سے تنگ آکر شاہِ جمال ثانی اپنے وطنِ عزیز کو خیر باد کہہ کر ہندوستان آئے اور ملیبار میں بود و باش اختیار کی۔ یہاں آپ قاضی القضات مقرر کئے گئے۔ شاہِ جمال کے فرزند سید شاہ تاج الدین کو سلطان علاء الدین نے قاضی العسکر کے عہدے سے سرفراز کیا۔ حضرت تاج الدین کے خاندان کے اردو اور فارسی اور عربی ادب کی ان مول اور نایاب کتابیں آج بھی مدراس کی اورینٹل لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان کتابوں کے ذخیرہ سے اتنی بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ علمی، ادبی اور تاریخی تصانیف اور تالیفات کا دور بہت شان دار اور وسیع رہا۔ بہرحال حضرت دلیل کے دونوں معزز سلسلوں میں علوم و مناصب کا تسلسل باقی رہا۔ مدورئی کے ماحول میں حضرت دلیل کا خاندان السنۂ شرقیہ میں ماہر و کامل سمجھا جاتا تھا۔ مدورئی[1] ٹمل زبان کا مرکز ہونے کے باوجود وہاں کے قاضی محلے میں فارسی اور دکنی زبان عام تھی[2]۔ دلیل نے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد امریکن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ گھریلو حالات کی ناہمواری کی وجہ سے آپ نے

---

[1] شمالی ہند میں بنارس اور متھرا کو جو عظمت حاصل ہے وہی عظمت اور شان و شوکت جنوب میں مدورئی (جو دراوڑی تہذیب و تمدن کا دیرینہ اور مقدس مقام ہے) کو حاصل ہے۔

[2] اس محلے کی عورتیں فارسی اور دکنی زبان میں بآسانی گفتگو کرلیتی تھیں۔

سلسلۂ تعلیم ترک کر کے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ چوں کہ آپ کی طبیعت علم و ادب کی طرف زیادہ مائل تھی اس لیے آپ نے Collectorate کی ملازمت سے سبکدوشی اختیار کر کے مقامی اسکول میں بطور اردو منشی درس و تدریس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اسی اسکول سے ترقی پا کر موصوف نے امریکن کالج مدورئی میں اردو لکچرار کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کا میلانِ طبع صغر سنی ہی سے شعر و شاعری کی طرف رہنے کی وجہ سے تعلیمی و تدریسی مشاغل سے ہٹ کر آپ نے علم و ادب کی بہت زیادہ خدمات انجام دیں۔ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ موسیقی، شہ سواری پہلوانی اور سیر و سیاحت میں بھی آپ نے اپنی طبعی ہنر مندی کے نمایاں نقوش چھوڑے ہیں (باوثوق شہادتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت جمیلؔ[1] نے چند ڈرامے بھی مدراس کے ذی وقار ماحول میں اسٹیج کئے تھے جن کی موسیقی خود آپ کے فرزند قیصر حسین نے ترتیب دی تھی)۔ گویا حضرت دلیلؔ کو علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کا ذوق قدرتی طور پر عطا ہوا تھا۔ ایک طرف مسائل تصوّف اور عرفان و آگہی سے گہرا لگاؤ اور دوسری طرف فنونِ لطیفہ سے والہانہ وابستگی کے متضاد رجحانات کی ممزوجیت بڑی

---

[1] حضرت دلیلؔ مرحوم کے چھوٹے بھائی جمیلؔ ٹمل ناڈو کے مشہور و معروف ڈرامہ نویس ہیں۔ موصوف کے کئی مختصر ڈرامے 'مرتا کیا نہ کرتا'۔ 'ایک رات'۔ اور 'کسی کو کیا خبر'۔ ماہ نامہ 'فصاحت' حیدرآباد میں 1942ء اور 1943ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں اور بہت سارے ڈرامے مثلاً 'اسیر شہزادی'، 'غریب ماں'، 'نادرہ' اور 'آبرو' مدراس میں اسٹیج بھی کئے گئے۔ اردو ڈرامہ کے فن میں جتنی وسعت اور کشادگی جمیلؔ اور ان کے بھائی قتیلؔ نے دی وہ واقعی ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

تعجب خیز بات ہی مگر دلیل کی خداداد صلاحیتوں اور جودت طبع کی آئینہ دار تھی۔

1952ء میں حضرت دلیل امریکن کالج سے ریٹائر ہو کر مدراس آئے اور یہیں آپ نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ قیامِ مدراس کے دوران آپ نے کچھ دنوں کے لیے نیو کالج، مدراس میں اردو لکچرار کے فرائض انجام دئے۔ اس عہدے سے عہدہ برآ ہونے کے ڈیڑھ سال بعد مسلسل علالت کا شکار رہ کر 12 ار اگست 1957ء/1377ھ) ترسٹھ سال کی عمر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تعجب اس بات کا ہے کہ مرتے دم تک حضرت دلیل کی سانسوں کی زبان پہ صوفیوں اور درویشوں کا دیا ہوا وظیفہ "اللہ بس باقی ہوس" جاری تھا۔ یہ یقیناً حضرتِ دلیل کی قلندرانہ اور فقیرانہ عظمت و شان کی روشن دلیل ہے۔

حضرت دلیل بڑے مخلص اور ملنسار تھے۔ طبیعت میں عجز و انکساری اور شخصیت میں بڑی محبوبیت تھی۔ آپ بلند اخلاق، نفاست پسند اور عقل و دانائی کا منبع تھے۔ سچائی، سادگی، ہمدردی، زہد و تقویٰ قناعت و توکل اور صوم و صلوٰۃ کی پابندی کے پرنور جوہر سے آپ کی ذات و صفات معطر و منور تھی۔

علم و روحانیت اور شعر و ادب کا وہ چراغ جسے دنیا حضرت دلیل کے نام سے جانتی اور پہچانتی تھی اور جس کے فکری اجالوں کی ٹھنڈک سے ساری کائنات سرسبز و شاداب تھی وہ عہد آفریں شخصیت نام و نمود حصولِ شہرت اور دنیاوی طمع سے دور بہت دور اور عشق الٰہی میں چور چور تھی۔

حضرت دلیل شعری دنیا کے بے تاج شہنشاہ ہیں جن کی طویل

نظم "کائنات" بڑی معرکتہ آلارا تخلیق ہے۔ اس نظم میں موصوف نے اپنے مشاہدات، تجربات، تفکرات اور معلومات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ یہ طویل نظم گویا زبان و بیان کی پاکیزگی، تخیل کی بلند پردازی، مشاہدے اور تجربے اور تجزئے کی گوناں گوں خصوصیت کی بھرپور عکاس ہے۔ ؎

زندگی پیغمبرِ کامل کی اور ام الکتاب — رہنمائی کے لیے کافی ہے تایوم الحساب
دیکھ اس کو جو زمین و آسماں کا نور ہے — دیکھنے والوں کو دنیا جلوہ گاہِ طور ہے

نظم "کائنات" بقولِ حضرت دلیؔل بعض "قرآنی آیات" اور "احادیث نبوی ؐ کا خلاصہ سہی مگر ناچیز کی رائے میں یہ طویل نظم فلسفیانہ نکات" اسرار و تصوّف، رموزِ عرفانِ ذات و کائنات اور عشق و معرفتِ الٰہی کے اشارات و کنایات کا سرچشمہ بھی ہے۔ ؎

دولتِ عشقِ الٰہی سے جو دلِ آباد ہیں — خوف و غم، یاس و ہوس کی زد سے وہ آزاد ہیں
وصلِ حق تکمیلِ نفس و انتہائے ہوش ہے — بےخودی اس ہوش کا یک جلوۂ خاموش ہے

اس طویل نظم کے مطالعہ سے نہ صرف حضرتِ دلیؔل کی ذہنی اُپج، علمی پس منظر اور تعمق تنظری کے روشن خط و خال نمایاں ہوتے ہیں بلکہ قاری کے آگے اسلامی عقائد، ایمانی خوش بو اور روحانی تجلّیات کے دریچے بھی وا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان دریچوں سے چھنتی ہوی خنک کرنوں سے انسانی احساس و جذبہ آسودہ ہو جاتا ہے۔ حضرت دلیؔل کے اسلامی عقیدے کی ایک جھلک موصوف کے شعری آئینہ میں ملاحظہ فرمائیے: ؎

حرکتِ ازلی پہ قائم ہے نظامِ کائنات — نغمۂ سوزِ عمل ہے نغمۂ سازِ حیات
انہماک جاوداں ہے زندگانی کا ثبات — ہے سکوں ساماں جو بھی موت ہے اس کی برات
نوعِ انساں کو خدا کی دین جو اسلام ہے — حسنِ ایمان و عمل کا سرمدی پیغام ہے

حضرتِ دلیلؔ نے زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے نیکی اور بدی سے متعلق ایک اَن مٹ سچائی ہمارے سامنے رکھ دی ہے: ؎

ہے وہ نیکی جس سے حاصل ہو کمالِ زندگی

وہ بدی ہے جس میں پنہاں ہے زوالِ زندگی

"کائنات" سے متعلق حضرت دلیلؔ کا نقطۂ نظر مذہبی اور روحانی رشتوں کا پاس دار ہے۔ صالح روایاتی قدروں کا مرہونِ منت ہے یہی وجہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ؎

زندۂ جاوید حق کی سرمدی ہیں کُل صفات

نغمہ ہائے کُن سے ہے معمور بزمِ کائنات

حضرت دلیلؔ نے زندگی اور کائنات کے تجزیے اور اس کے نتائج کے استنباط میں بڑی ژرف نگاہی، مفکرانہ استعداد اور شاعرانہ خلّاقیت سے کام لیا ہے۔ اور تخلیقِ کائنات کے رموز سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ؎

ہے صفاتِ رب کا جلوہ یہ ظہورِ کائنات

یا مشیّت میں نہاں تھے یا عیاں ہیں ممکنات

نظمِ کائنات' کے غائر مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دلیلؔ علامہ اقبالؔ کے لہجے سے زیادہ متاثر ہیں۔ اور علامہ اقبالؔ ہی کی طرح موصوف نے اپنی شاعری کے توسط سے ایک عالم کو نہ سہی ایک دَور کو ضرور متاثر کیا ہے۔

اس نظم کے روشن خدوخال، صالح اور پاکیزہ احساسات اور جذبات کی زیریں لہروں سے آشنا ہونے کے بعد اتنی بات وثوق سے

کہی جا سکتی ہے۔ کہ حضرت دلیلؔ کا مقصدِ تخلیقِ نظم حیاتِ انسانی کی پاکیزہ اور اعلیٰ قدروں کی حفاظت اور اس کی تعمیر و تکمیل کے ساتھ انسان کے اخلاق و کردار کی گرتی ہوئی دیواروں کا بچاؤ بھی ہے : ؎

عقل و قدرت لاکھ ہو، تکمیلِ اخلاقِ بشر
ہوا سدا پابندئی احکامِ رب پر منحصر[1]

خالقِ نظمِ کائنات نے شاعری کے تعلق سے کہا ہے کہ : ؎

شاعری سوزِ حیات و ندرت و تخلیق ہے
فلسفہ فکر و نظر ہے، بحث ہے تحقیق ہے

ہمارے یہاں آج کل نہ اردو شاعری کی قدر ہے نہ قیمت اور نہ ہی اس فنِ شریف کے بہی خواہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے حضرت سید صادق الحسینی شریف مدراسی[2] (المتوفی 1322ھ) نے بھی اپنے دور کی ناقدری اربابِ ہنر کا رونا روتے ہوئے کہا تھا۔ ؎

مدراس سا ناقدر کوئی شہر نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی صاحبِ علم و دانش اور خسروانِ مملکتِ شعر و ادب حضرت دلیلؔ کی طویل نظم "کائنات" اور ان کے ہم عصر یا حالیہ دور میں لکھی ہوئی طویل نظموں مثلاً حضرت امانی بلی کنڈوی (1386ھ)

---

[1] نظموں غزلوں اور قطعات کا مجموعہ "نغمۂ درویش" مطبوعہ اعجاز پریس حیدرآباد

[2] مصنفِ "حدیثِ شریف"، اس شعری مجموعہ کی اشاعت کے بعد اس وقت کے قاضئ شہر نے شریف مدراسی کو کفر کا فتویٰ دیا تھا۔

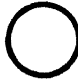
کی گلشنِ سیرت"، حضرت دانش فرازی کی" نالۂ فرات" اور "محسنِ اعظم"،
کاوش بدری کی" کاویم"۔ مولانا حافظ باقوی کی" قمر نامۂ اسلام" اور حسن
فیاض کی" مدح ساقیٔ کوثر" کو حرمت الاکرام کی" کلکتہ ایک رباب"
جوش ملیح آبادی کی" طلوعِ فکر" عمیق حنفی کی" سندباد" اور "سلسلۃ
الجرس" اختر الایمان کی" یادیں" اور کمار پاشی کی" ولاس یاترا" کے تناظر
میں دیکھے گا تو یقیناً وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ تامل ناڈو کے فن کاروں کی یہ طویل
نظمیں بھی موضوع اور معیار و افادیت کے اعتبار سے اردو ادب کے شعری کارناموں
میں نہ صرف اضافہ کی حیثیت رکھیں گے بلکہ علوم و فنون کی تجلیات میں ہمہ گیر
اہمیت کا باعث بنیں گے۔

حضرتِ دلیل نے جہاں" پروانہ"۔" صوفی"۔" بلبل"۔" انسان"۔" کشمیر
" ہمالہ" اور" راس کماری" جیسی موضوعاتی نظمیں لکھیں[1] وہیں زمانہ کے چلن کے مطابق
غزلیں اور قطعات بھی لکھے ہیں۔ ان کی تمام تر نظمیں منظر کشی، جذبات نگاری اور محاکاتی
انداز سے مملو ہی نہیں بلکہ نظیر اکبر آبادی کی نظموں کی طرح جذب و کشش کی شان و
شوکت، احساس کی بوقلمونی اور خیال آفرینی کی مہک سے لیس ہیں۔

بہ حیثیتِ مجموعی حضرت دلیل کی شاعری میں مضمون آفرینی اور
تہ داری کے علاوہ زبان و بیان کی حلاوت، فکر و اظہار کی جلوہ گری، سلاست و
روانی کی دل کشی اپنی ارتقائی ضوفشانیوں کے ساتھ موجود ہیں جو ایک فن کار
کو اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔ ●●

۱۹۹۳ء
مطبوعہ" ادبی ایڈیشن" پندار"
پٹنہ (بہار)

[1] نظموں، غزلوں، قطعات کا مجموعہ" نغمۂ درویش" مطبوعہ اعجاز پریس حیدرآباد 1968ء



علّامہ فدوی باقوی کا فکری سفرنامہ

عادل شاہی سلطنت کے زوال کے بعد بیجاپور کے اکثر اہلِ علم وفضل اور صوفیائے کرام نے کرناٹک کا رُخ کیا اور اس کے پایۂ تخت آرکاٹ اور اس کے مضافات بالخصوص ویلور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ویلور کی سرزمین اتنی زرخیز اور خوش گوار تھی کہ ان علماء و شعراء نے اس زمین سے اپنا اٹوٹ رشتہ جوڑ کر اس کی مٹی سے وہ نورانی کرنیں چار سو پھیلائیں کہ اس زمین کی مہکتی ہوئی فضائیں روحانی جلوہ گاہ کے ساتھ ساتھ علم وادب کی آماجگاہ بھی بن گئیں۔ اس سلسلے کی چند کرنوں میں میر ولی فیاض ولّی ویلوری سید شاہ ابو الحسن قربی ویلوری، سید شاہ عبد اللطیف قادری ذوقی، محمد باقر آگاہ ویلوری، عبد القدوس صفو ویلوری، منوّر نظر آتے ہیں۔ انہیں منوّر کرنوں سے مولانا عبد السلام کمالی ویلوری، مولانا جعفر حسین فیضی صدیقی ویلور بدر الحسن بدر جمالی ویلوری اور مولانا نثار احمد فدوی باقوی بھی اپنے فکر وفن کا

رشتہ استوار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہم شخصیاتی عصبیت کے اتھاہ دلدل میں پھنسے ان فن کاروں کی تخلیقی صلاحیتوں سے اس طرح اغماض برت رہے ہیں جیسے یہ فن کار ہمارے درمیان ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں ہیں حالاں کہ ان فن کاروں سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہے۔ پتہ نہیں یہ علمی اور ادبی احسان فراموشی اور عصبیت کے جراثیم کب تک اور کہاں تک انسانی لہو میں چکّر کاٹتے رہیں گے۔ آخر کار کوئی تو اس کا تدارک اور مجرّب علاج ہو۔ ورنہ زندگی اور فن کا درمیانی رشتے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ کر رہ جائیں گے اور اردو ادب میں دور دور تک زندگی کے عطا کردہ احساس، جذبہ، اظہار اور فکر و فن کی لاشیں رہ جائیں گی جن سے نہ کوئی شخصیت ابھرے گی اور نہ کوئی آواز۔

حضرت مولانا نثار احمد فدوی باقوی 1928ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد بزرگوار مولانا مولوی حبیب اللّٰہ ندوی باقوی اپنے وقت کے جیّد عالم، ماہر لسانیات، مفتی و فقیہہ اور کئی علمی و دینی کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا فدوی باقوی نے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم باقیات الصالحات عربک کالج سے حاصل کی۔ 1945ء سے 1953ء تک تجارت کے سلسلہ میں کیرلا ترودرم گئے اور اس کے بعد دوبارہ 1953ء کے اواخر میں باقیات ویلور لوٹ آئے۔ اور یہیں ناظم کتب خانہ کے عہدے پہ فائز ہو گئے اور آج بھی اسی عربک کالج میں منتظم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

مولانا فدوی باقوی کا شمار تامل ناڈو کے اُن ارباب علم و فن میں ہوتا ہے جنہوں نے تامل ناڈو کے ادبی ماحول کو خاص توجہ اور بصیرت کے ساتھ نیا رنگ و نیا آہنگ بخشا۔ آپ فن پہ بڑی اچھی دسترس رکھتے

ہیں ۔ آپ کا مطالعہ وسیع ہے ۔ فکر بلند اور عزائم راسخ ۔ آپ کی شاعری کا لہجہ قدیم ہونے کے باوجود تنوع، جدّت اور سحر طرازی کا حامل ہے ۔ نثر اور نظم دونوں پر عبور حاصل ہے ۔ آپ کی تخلیقات میں اگرچہ عصری آگہی اور جدید حسیّت کے عناصر بہت کم پائے جاتے ہیں ۔ لیکن آپ نے جن نوجوانوں شعراء کی ذہنی، ادبی اور علمی تربیت کی ہے ان کے لہجے کا تیکھاپن جدیدیت سے لبریز ہے ۔

یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہ آسکی کہ مولانا فدوی نے کیوں ہمیشہ اپنی جامع الکمال شخصیت اور جامع الصفات ذات کو گلاب کی مہین پنکھڑیوں میں پوشیدہ رکھا ۔ نہ جانے اس گوشہ نشینی میں کیا راز پنہاں ہے اور اس راز کے پیچھے نہ جانے وہ کون سی تمنّا جلوہ گر ہے جس کے نظارے کے لیے ایک کائنات منتظر ہے ۔ مولانا فدوی کو اس گوشہ نشینی سے باہر نکالنے کا قصور کچھ تو ہمارے اُبھرتے ہوئے تنقید نگاروں پر ہے اور کچھ ان کے اپنے قریبی دوست واحباب پر بھی، جو اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ اچھے نثر نگار بھی ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کے قریبی دوستوں نے ان کے وجود میں چھپی ہوی علمی وفکری ہمہ جہت شخصیت کو ڈھونڈ نکالنے اور اُسے منصۂ شہود پر لانے کی کوشش ہی نہیں کی ۔ اور اپنا فریضہ بھی نہیں سمجھا، بلکہ ان کے متعلق دوستانہ محبت سے سوچنے اور سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی ۔ پتہ نہیں ہمارا آیندہ مورخ اور ادبی تاریخ اس دوستانہ ادبی دشمنی کو کس نام سے یاد کرے گی ۔

مولانا فدوی کا ادبی سفر جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں ہمارے آس پاس کے سانس لیتے ہوئے شاعر وادیب کا سفر اپنی تھکی ہوی

سانسوں کے ساتھ اپنا دم توڑ دیتا ہے ۔ گویا میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا
کہ مولانا فدوی جس منزل کی طرف گامزن ہیں اس منزل کی راہیں ان کی
تلاش و جستجو کی آنکھوں کو ایک نئی روشنی اور توانائی عطا کرتی ہیں ۔
اور ان کے اس ادبی سفر میں تھکن نام کی کوئی شئے دور دور تک نظر
نہیں آتی ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جس صنف کو سینے سے لگایا اور
اُسے اپنی ذہنی انگلیوں کا لمس عطا کیا اس صنف کا دامن وسیع اور
روشن ہو گیا ۔ ان کے علمی استعداد کے تمام تر جوہر جہاں شعری جلوہ
گاہ میں معطر ہیں وہیں نثری بارگاہوں میں بھی منور ہیں ۔ ہمارے
اربابِ علم و فن کو یہ جان کر اچنبھا ہوگا کہ مولانا فدوی نے ہمارے
افسانوی ادب کو بھی اپنے فکر و جذبہ سے مالا مال کیا ہے ۔ ان کے افسانوں
بالخصوص "مامتا"، "آتشِ خاموش" اور "موت کا کنواں" (جو
1942ء سے 1945ء کے درمیان لکھے گئے تھے) کا محور ہماری زندگی کے بطن
سے جنم لینے والی برائیوں کے خلاف جنگ اور اس جنگ سے جو نتائج برآمد
ہوتے ہیں اس کی بہترین عکاسی کرتا ہے ۔ تعجب اس بات کا ہے کہ آج تک
مولانا فدوی نے اپنی فن کارانہ شخصیت کے اس پہلو کو بھی صیغۂ راز
میں رکھا ۔ گویا انہوں نے اپنے آپ پہ ایک طرح کا معصومانہ ظلم
کیا ہے ۔ اس ظلم کے سزاوار خود فدوی ہی نہیں بلکہ ہمارے اپنے نقاد
اور ادیب بھی ہیں جو سستی شہرت کے ڈھنڈورچی بنے اپنے کھوکھلے
نام اور کام کے طغرے اپنی گردنوں میں لٹکائے بصد شان و شوکت
ہر ادبی محفل کی زینت بنتے رہتے ہیں ۔

اردو کے شعری ادب میں کاغذ اور قلم کا رشتہ بہت نازک

اور اہم ہوتا ہے اس رشتے سے وفا کرنے اور اس رشتہ کو زندگی اور زندگی کو نئی جہتیں دے کر ایسے آفاقی سرحدوں تک اٹھانے والا شاعر ہی در اصل عظیم شاعر ہوتا ہے۔ آج کل ہمارے ارد گرد جو شاعر اپنے بے رنگ و روپ انا کی پرورش اور پرداخت میں کوشاں ہیں ان میں اس رشتہ کی پاس داری کا احساس ہے نہ پہچان، وہ دھوم دھڑلے کی شاعری کو اپنی انا کی شناخت اور اپنی ذات کی پہچان تصور کرتے ہیں۔ کاغذ اور قلم سے زیادہ ان شعراء کا شعری رشتہ سطحی جذبے اور مترنم آواز سے گہرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ترنم باز شعراء ہر مقامی اور کل ہند سطح پہ ہونے والے مشاعروں میں کامیاب و مقبول واقع ہوئے ہیں۔ مگر مولانا فدوی کی شاعری ان سطحی عوامل اور مضمحل عناصر سے بہت بالاتر اور پاک ہے۔ ان کے یہاں کاغذ اور قلم کے رشتہ کا وہ حسین سنگم ملتا ہے جس میں گنگا جمنی کیفیت کے ساتھ ساتھ جذبہ و فکر کی اچھی ترسیل پائی جاتی ہے۔ مولانا فدوی نے اردو شاعری کی تمام تر اصناف کو اپنی ذہنی روشنی سے آراستہ کیا ہے۔ بالخصوص صنفِ رباعی میں ان کے تبحر علمی اور فکری اُپج کی وہ ست رنگ چھوٹ نظر آتی ہے۔ جو قاری کو امجد حیدر آبادی کے رباعیاتی جزیرے کے بہت قریب تر کر دیتی ہے۔

صنف رباعی کے تعلق سے یہاں یہ عرض کرتا ہے کہ حالی و اکبر الہ آبادی نے اصلاحی رباعیات، مرزا یگانہ چنگیزی اور تلوک چند محروم نے مذہبی رباعیات (حمد و مناجات) جوش، فراق و ساغر نے عشقیہ، خمریہ اور سماجی رباعیات اردو ادب کو دے کر اس صنف کو حیاتِ جاودانی بخشی ہے۔ جدید دور میں امجد حیدر آبادی نے رباعیات میں ایمانی، روحانی

اور عرفانی صداقتوں اور حقیقتوں کا وہ روشن آئینہ دکھایا ہے جس کے مداحوں میں مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی اور علامہ اقبال[1] بھی تھے۔ اس اعتبار سے اردو ادب میں نعتیہ رباعیات کی اولیت کا سہرا یقیناً جنوب کے صوفی حضرت امجد حیدرآبادی کے سر جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ حضرت امجد کے بعد دورِ جدید میں رباعیاتِ سیرت کے لیے علامہ فدوی باقوی کا نام لیا جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ مولانا فدوی کی فنی اور فکری وسعتوں کو پرکھنے والی آنکھ آج دور دور تک موجود نہیں ہے۔ اور شمال کے بعض اکابرِ ادب کی صوبجاتی عصبیت کی شکار ذہنیت سے بھی اس کی امید کرنا عبث ہے۔

رُباعیات

دل جوئیٔ حادثات کی، ہر پہلو ! سلجھائے عروسِ زندگی کے گیسو
ہر گوشۂ دل بنا ہمیں سے گلشن پھیلائی محبت کی ہمیں نے خوشبو



دم ساز الم ہیں، چارہ سازِ غم ہیں اے دور! نہ بھول ہم سے مخلص کم ہیں
کیا کہئے اب اور وصف ابنائے زماں ناقدروں کے درمیان فدوی ہم ہیں



کہنے کو بہت رفیق ہیں ہمدم ہیں دکھ درد میں ساتھ دینے والے کم ہیں
ہم ہر غمِ دنیا میں برابر کے شریک اپنا جو ہے غم اس میں تو تنہا ہم ہیں

---

[1] مکتوب گرامی حضرت امجد حیدرآبادی۔ محررہ 28 اکتوبر 1954ء
ڈاکٹر سلام سندیلوی

رباعیاتِ

کرتا ہوں جو ذکر، باوضو کرتا ہوں
کرتا ہوں ثنا تو قبلہ رو کرتا ہوں
جس پاک آرزو کا میں اہل نہیں!
اللہ مرے وہ آرزو کرتا ہوں

وہ مہر کہ مہر جس سے ضو پاتا ہے
وہ ماہ کہ جس سے ماہ شرماتا ہے
دنیا میں ہے جس سے نورِ مطلق کی نمود
دنیا میں وہ نور جلوہ فرماتا ہے

ہر بزمِ نظر میں روشنی تجھ سے ہے
ہر انجمنِ دل میں زندگی تجھ سے ہے
یہ دانش و علم و آگہی بشر میں کب تھی
یہ دانش و علم و آگہی تجھ سے ہے

طائف پہ شاہِ ھدیٰ کا ہوتا ہے نزول
توحید کا پہنچاتے ہیں پیغام رسول
اخوان شیاطین کے دلوں نے نہ کئے
ایمان کے، عرفان کے، انوار قبول

اصنافِ سخن میں ہے رباعی مشکل
سیرت کا بیاں پھر انتہائی مشکل
یارب! تو کشائندۂ ہر مشکل ہے
تھی ورنہ مجھے تو لب کشائی مشکل

اصنافِ سخن میں رباعی کو بہت مشکل صنف مانا گیا ہے۔ ایک طرف اس کی ہیئت، قیود و بند اور مخصوص اوزان جن کی وجہ سے اگر دامن تنگ ہو جاتا ہے تو دوسری طرف غلوئے خیال اور کمالِ اعجاز اور آخری مصرع میں زورِ بیان کی رفعت کی وجہ سے اس میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ مذکورہ تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مولانا فدوی کے

پاس یہ مشکل نہیں رہتی ۔ آج کل مولانا فدوی صنفِ رباعی کی طرف ہی نہیں بلکہ صنفِ نعت کی طرف بھی مائل نظر آتے ہیں ۔ اور ان دونوں اصناف کے امتزاج سے جو رباعیاتِ سیرت وجود میں آرہے ہیں وہ یقیناً اردو ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ ہیں ۔

مولانا فدوی کے سلجھے ہوئے سنجیدہ تنقیدی جھرنوں سے بھی مدراس کا اردو ادب سیراب و شاداب ہے ۔ یہ سیرابی اور شادابی کے بہترین منظر ہمیں ان کی زیر ترتیب کتابیں "حاصلِ مطالعہ" اور "سیّارگانِ جنوب" میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں ۔ اگر یہ دونوں کتابیں اشاعت کی منزل تک رسائی حاصل کرلیں تو یقیناً مدراس کے تنقیدی اردو ادب میں ایک اہم ترین اضافہ ثابت ہوں گے ۔

1974ء میں مولانا فدوی کی تالیف "مجدّدِ جنوب" باقیات الصالحات کے صد سالہ جشن کے موقع پر منظر عام پر آچکی ہے ۔ یہ کتاب وہابُ العلوم شمس العلماء اعلیٰ حضرت عبدالوہاب کی مختصر سوانح حیات پر مشتمل ہے اس کتاب سے بانئ باقیات عبدالوہاب کی مذہبی علمی اور دینی خدمات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ۔

بحیثیتِ مجموعی مولانا فدوی باقوی کی شخصیت اور رفقِ اردو ادب کی وسیع تر کائنات میں ایک آئینۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے ۔ جس میں اپنے دور کا کوئی بھی محقق اور مورخ اپنا عکس دیکھے بغیر تاریخ کی منزل تک بآسانی نہیں پہنچ سکے گا ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ مولانا فدوی کی پہچان اپنے دور کی پہچان ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کی پرانی اور نئی نسل کی صالح قدروں کا شناخت نامہ بھی ہے :

کلام کا نمونہ

قطعات

آرزوؤ! تمہارے ہاتھوں آج — جتنا ہونا تھا ہو چکے رسوا
اور آ پہنچے اس مقام پہ ہم — ہیں کہاں کچھ پتہ نہیں چلتا

وہ ہمارے نہ ہو سکے لیکن — اور کے ہو سکے کہاں ہم بھی
باہمہ دعوئ زباں دانی — اُن کے آگے ہیں بے زباں ہم بھی

زلفِ ہستی سنوارنے والے — اپنی ہستی کے غم میں گھلتے ہیں
بے خبر اپنے آپ سے ہیں وہی — جن پہ عالم کے راز کھلتے ہیں

عشق ناکام آرزو ہے ابھی — حسن افسونِ رنگ و بو ہے ابھی
اہلِ عشرت کی محفلوں میں دل — ایک ٹوٹا ہوا سبو ہے ابھی

ترے جہاں کی مجھے ذلتیں گوارا ہیں — مگر مذاق میں اپنا بدل نہیں سکتا
تری روش، ترا جادہ تجھے مبارک ہو — میں اک قدم بھی ترے ساتھ چل نہیں سکتا

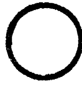
ملا ابھی نہ ملا غم رسیدہ دل کو قرار — برس رہے ہیں ابھی تک مری نظر سے شرار
تری نظر میں ہیں ہنستے ہوئے بہار کے پھول — مری نظر میں ہے لٹتی ہوئی چمن کی بہار

ابھی راہ کے پیچ و خم میں ہیں ساقی
قیود وجود و عدم میں ہیں ساقی

بڑھا اور ان منزلوں سے کچھ آگے
ہم اندیشۂ بیش و کم میں ہیں ساقی

اشعار

- کہاں کا انقلابِ نو، کہاں کا آفتابِ نو
  پریشانی کے ماروں کی پریشانی نہیں جاتی
- جو دل کی ہے کیفیت اس کو الفاظ میں لانا مشکل ہے
  آساں ہے سب کی سُن لینا، اپنی ہی سنانا مشکل ہے
- ہم سے اخلاص کے ماروں پہ بنامِ اخلاص
  ہر نفس اک کرم ہم نفساں ہوتا ہے
- کون دیتا ہے صدا سنتا ہے کون
  گوش بر آواز ہم، آواز ہم
- پریشاں دل کی پریشانیاں ہیں
  سفینہ، تلاطم، تلاطم سفینہ
- عرفان کی یہی حد ہے تو ایقان کی یہی اصل
  اوہام سے نکلے تو پھر اوہام کو پہنچے
- راستہ راستہ نہیں دیتا
  ہے بہت دور بات منزل کی
- عُمر بھر کیں ہم نے دنیا سازیاں
  بن سکے فدوی نہ دنیا ساز ہم
- بننے کا فن نہ آیا، جینے کا نہ ڈھب ہم کو
  آگے نہ بڑھا آگے اے دستِ طلب ہم کو
- یوں ہم نے نوازا ہے ہر نوع اسے فدوی
  بس رہ گئی تکتی ہی دنیائے ادب ہم کو
- ہو کوئی بزمِ فدوی صاحبِ فن صاحبِ فن ہے
  ہو کوئی بحر اس کی گوہر افشانی نہیں جاتی



مولانا راہی فدائی اور کڈپہ میں اردو

تحقیق اور تنقید کا رشتہ بہت گہرا اور مضبوط رہا ہے۔ تحقیق کے بغیر تنقید اور تنقید کے بغیر تحقیق ایک نامکمل سی تاریخ ہے۔ سقراط نے سب سے پہلے انسانوں میں تنقید کے جذبہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور ہمیشہ اپنے شاگردوں سے کہا کہ "سوچو اور پھر عمل کرو"، اُس دَور کے یونانی حکمراں سقراط کے ہم خیال نہ ہوئے۔ انہوں نے سقراط کے نئے خیالات کو رد کرتے ہوئے اس عظیم فلسفی کی آخری سانس تک کو سزا دی۔

پیٹرارک سے پہلے رومی کھنڈرات کوئی معنی نہیں رکھتے تھے، وہ اینٹوں اور چٹانوں کے ایک ڈھیر سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ پیٹرارک نے لوگوں کو قیصر روم کی یادگاروں کی طرف متوجہ کرایا اور انہیں آثارِ قدیمہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے اور ذہنی طور پر ان میں دلچسپی لینے کا فن سکھلایا۔ یہیں سے لوگوں میں تحقیق اور تنقید کا درک پیدا ہوا، اور انہوں نے عظیم کائنات کی عجیب و

غریب اور اپنی فہم و ادراک سے بالاتر پیچ در پیچ کھاڑیوں میں کھو جانا اور ان پیچوں سے نکلنا سیکھا۔ نشاۃ ثانیہ نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ نت نئی ایجادات معرض وجود میں آئیں اور تلاش و جستجو کی کرنوں سے نئے نئے انکشافات کے جزیرے رونما اور روشن ہونے لگے۔ اسی تحقیق اور تنقید کی برکت سے آج ہماری کائنات پُر نور اور دیدہ زیب اور پُر کیف نظر آنے لگی ہے۔ اسی تحقیق اور تنقید نے بڑے بڑے فن کار، شاعر، ادیب، نقاد، معمار، نقاش، سنگ تراش اپنی کوکھ سے جنم دئے جو آسمانِ فکر و فن اور دنیا کی تاریخ ادب پر نیّرِ اعظم بن کر چمکے۔

ہر فن کار کے اندر ایک نقاد بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ جو فن کار کو ہمیشہ بیدار رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن کار اپنے خارجی اور داخلی چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے اُن کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور اپنی ایک جُداگانہ راہ بناتا ہوا آگے کی سمت نکل جاتا ہے ورنہ ڈانٹے کی ڈیوئن کامیڈی، ہومر کی رزمیہ نظمیں، مائیکل آنجیلو کی سنگ تراشی کا شاہ کار (Last Judgement) اور لیونارڈو ڈی ونسی کی نقاشی کا بہترین نمونہ (Last Supper) عالم شہود پر نہ آئے ہوتے، والمیکی کی رامائن، ویاس کی مہابھارت، کالی داس کی شکنتلا فردوسی کا شاہ نامہ، کبیر داس اور امیر خسرو کا فن، میر و غالب، مومن و اقبال کی شاعری وغیرہ زندہ جاوید نہ ہوئے ہوتے۔

مولانا راہی فدائی کی شخصیت اور فن اردو ادب کے وسیع تر جزیرے میں اس نور افشاں افق کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی کرنوں سے نہ صرف سرزمین کڈپہ (آندھرا) اور ویلور (تمل ناڈو) کے دینی مدارس بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ادبی تنقید اور علمی تحقیق کی فضائیں آج بھی روشن اور منوّر ہیں۔ راہی نے

جہاں تحقیق اور تنقید میں نئے معلوماتی دائروں کو وسعت اور کشادگی بخشی ہے وہیں اپنی غزلیہ شاعری کو کشش آور فکر، حیات آفریں اظہار، جلوہ فشاں احساس اور جذبہ کی ست رنگ دھنک سے لیس کیا ہے۔ موصوف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کہ آپ نے شاعری کی زبان میں جانوروں، کیڑے مکوڑوں سے کام لیتے ہوئے آج کے معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ آپ نے بندر نچاتے ہوئے، اُلوؤں کے نقاب گراتے ہوئے، بچھوؤں سے ڈنک پر ڈنگ لگاتے ہوئے آج کے انسانی ذہن میں جنم لینے والی درندگی کی بخوبی منظر کشی کی ہے۔

راہی فدائی کی شعری تخلیقات سے ہٹ کر نثری تالیفات پر نظر جاتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ مولانا نے یہاں بھی اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ آپ کی تالیفات میں سے پہلی تالیف "مسلکِ باقیات" مطبوعہ ۱۹۹۱ء موجودہ مذہبی افراط و تفریط کے ماحول میں ایک طرح کی راہِ اعتدال کی نشان دہی کرتی ہے۔ آپ کی دوسری کتاب "تجزیہ" ہے (مطبوعہ 1988ء) جس مولانائے موصوف نے اپنے گہوارۂ علمی (مدرسہ باقیات صالحات ویلور) کے بانی حضرت علامہ شاہ عبدالوہاب صاحب قادری قدس سرہٗ کے بارے میں کی گئی غلط تاریخ نگاری کا مدلل رد فرمایا ہے۔

ایک اور تالیف "باقیات ایک جہاں" (مطبوعہ 1985ء) میں بانیٔ باقیات اور اکابرینِ باقیات کے سوانحی اور علمی کارناموں نیز ادبی تخلیقات کو یکجا کر کے اپنی تعلیم گاہ کا بھرپور حق ادا کیا ہے۔

"اکتسابِ نظر" آپ کی چوتھی تحقیقی کتاب ہے۔ جس کے غائر مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا راہی فدائی میدانِ شاعری کے شہسوار ہی نہیں بلکہ مملکتِ نثر کے شہنشاہ بھی ہیں۔ موصوف نے بڑے انہماک اور بڑی

جانکاہی سے جنوبی ہند کے چند اہم ادبی کھنڈرات اور آثار قدیمہ کی از سرِ نو کھدائی کی اور تلاش و جستجو کے بعد بعض پوشیدہ خزانوں کو منصۂ شہود پہ لاکر دنیائے ادب کے معلوماتی ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ بالخصوص ولی ویلوری کے تحقیقی مضمون سے موصوف کی نکتہ رسی، تعمق نظری، تحقیقی اُپج اور بلند پایہ دانز جستجو کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا نے جس خوبی سے حجّت قائم کر کے مولوی نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے مغالطہ کو دور کیا ہے یہ کسی عام محقق کے بس کی بات نہیں۔

میں سمجھتا ہوں مولانا راہی کی اس تخلیقاتی ترقی اور ناموری میں شہر کڈپہ اور مدراس کے چند اساتذۂ کرام و علمائے عظّام مثلاً حضرت مولانا سید شاہ محمد یعقوب بغدادی باقوی، حضرت مولانا محمد جعفر حسین فیضی صدیقی حضرت مولانا فدوی باقوی اور آپ کے شفیق استاذ اور مرشدِ روحانی شیخ التفسیر حضرت علاّمہ سید شاہ عبد الجبّار باقوی قادری دامت برکاتہم کی دعاؤں اور نیک تمنّاؤں کا خاص دخل رہا ہے۔ جس کا اعتراف بارہا راہی نے کیا ہے۔ اور راقم الحروف کی بھی یہ خوش قسمتی ہے کہ ان حضرات کی صحبتوں سے مستفیض ہوتے ہوئے اپنی دینی، علمی اور ذہنی پیاس بجھائی ہے۔

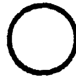
مولانا راہی سے راقم کے تعلقات دوستانہ اور برادرانہ نوعیت کے ہیں۔ راقم کو آپ کے اخلاص و مروت کے علاوہ مرنجان مرنج طبیعت اور صلح کل کے مزاج نے بہت متاثر کیا ہے اور اس کے علاوہ آپ کے پاس زندگی کو سنجیدگی سے سمجھنے اور برتنے کا شعور بھی نظر آتا ہے موصوف کی یہ خوبیاں یقیناً عطائے خداوندی ہیں۔ میرا یہ ایقان ہمیشہ رہا ہے کہ اس طرح کا تخلیقی اور آفاق گیر نقش چھوڑنے والا ذہن کا صرف عظیم ہی نہیں ہوتا بلکہ

عشقِ محمدیؐ میں سرشار و مخمور بھی رہتا ہے۔ یہ صفات مولانا راہیؔ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور وہ عشقِ محبوبِ خدا کا ایک ایسا آئینہ ہیں جس کا عکس دینی آماجگاہوں سے نکل کر اردو ادب کی بارگاہوں میں جلوہ ریز و نقش گیر ہے۔

ایک مرتبہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ بابرکت میں پہنچے اس وقت آپ کے ساتھ حضرت خواجہ بابا فریدالدین گنجِ شکر بھی تھے (جو بہت کم سن تھے۔) خواجہ غریب نواز نے اپنے خلیفہ سے دریافت فرمایا: کہ بختیار تو نے آج اس باز (بابا فرید گنج شکر) کو کہاں سے پکڑا، یہ تو ساتویں آسمان پہ پرواز کرے گا۔" راہیؔ فدائی کی تنقید اور تحقیق سے متعلق میرا عقیدہ بھی یہی ہے۔

آخر میں میں یہی کہوں گا کہ مولانا راہیؔ فدائی کی پیشِ نظر کتاب "کڈپہ میں اردو" سے تاریخِ ادب اردو میں ایک زرّین باب کا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ایک مخصوص علاقے کے ادب کا جائزہ ہے، بلکہ اس کے توسط سے دنیائے اردو کی تاریخی اہمیت کو اُجاگر کرنا اور اسے مناسب مقام عطا کرنا مقصود ہے۔ ہماری اپنی تاریخیں چاہے کسی زبان سے متعلق کیوں نہ ہوں، جب تک اس میں علاقائی رُجحانات کو فروغ نہیں ملے گا، اس وقت تک تاریخ کا حق ادا نہیں ہوگا۔ دہلی اور لکھنؤ کی ادبی تاریخ کی جس قدر وقعت اور اہمیت ہوگی اتنی ہی جنوبِ بعید کے غیر معروف شہر کڈپہ، ویلور اور آرکاٹ کی ادبی تاریخ بھی اپنی خاص قدر و منزلت اور بلند و بالا شان و شوکت کی حامل ہوگی بشرطیکہ ہمارے غیر متعصب نقادوں اور محققوں کی نظریں ہر ریاست کے فن کاروں کے کارناموں پر رہیں نہ کہ بھاری بھر کم شخصیت اور وطنیت پر۔

مطبوعہ: "کڈپہ میں اردو" 1992ء



صنفِ دوہا اور ساغرؔ جیدی

قدیم اصنافِ شاعری میں "دوہے" نے ایک طویل سفر طے کیا ہے، اس صنف کی پرورش اور پرداخت میں حضرت امیر خسرو، کبیر داس، کالی داس اور عبدالرحیم خان خاناں نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

حضرت امیر خسرو نے اپنے دور میں گیتوں، کہہ مکرنیوں اور دوہوں کے علاوہ ایک اور صنف ان ملی (بے جوڑ، بے تکی، بے میل) پر بھی کافی توجّہ دی تھی۔ اس نظم میں انہوں نے چند بے جوڑ چیزوں کو جن میں باہم کوئی علاقہ نہیں ہوتا ربط پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی مثلاً: ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

"جس دور میں ایسی نظموں کا رواج تھا، لوگ بولتے اور سمجھتے تھے، اب نہ کوئی بولتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ لہٰذا متروک ہے۔" (مہذب اللغات: جلد اول ص ۹۱۵)

"دوہے کے سم" (پہلا اور تیسرا لخت) میں 13 اور 'وشم' میں دوسرا اور چوتھا لخت میں 11 ماترائیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر مصرع میں 24 ماترائیں ہوتی ہیں۔ لیکن بقول ڈاکٹر گیان چند جین 24 یا 23 ماترائیں بھی ہو سکتی ہیں[1] نمونتہً یہاں 24 ماتراؤں والا کبیر داس کا ایک دوہا ملاحظہ فرمائیں: ؎

منکا پھرت جگ گیا، من کا گیا نہ پھیر

پہلا چرن ۱۳ ماترائیں ، دوسرا چرن ۱۱ ماترائیں

کر کا منکا چھاڑ کے ، من کا منکا پھیر

تیسرا چرن ۱۳ ماترائیں ، چوتھا چرن ۱۱ ماترائیں

آج جب بھی "دوہے" کا ذکر آتا ہے تو فوراً ہمارے ذہن میں جمیل الدین عالی اور ناؔدم بلخی کی شخصیتیں ابھر آتی ہیں۔ ان دونوں شعراء نے اس صنف کے دامن کو وسعت اور کشادگی بخشنے کی جو شعوری کوششیں کیں وہ اردو ادب میں یقیناً ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

"دوہا" حقیقتاً میں صوفیانہ افکار اور درویشانہ تخیلات کے اظہار کے لیے موزوں صنفِ شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف سادھوؤں سنتوں، مذہبی رہنماؤں اور درویشوں کے ہاتھوں خوب پھلی پھولی اور پروان چڑھی۔ درویشوں اور صوفیوں ۔ اس صنف کے ذریعہ اپنے دور کی سچّائیوں ، حقیقتوں اور حیات و کائنات کے رموز کی نقاب کشائی اور زندگی کے باریک نکتوں کی نشاندہی بڑے تیکھے اور نوکیلے انداز میں کی تھی۔ ان کے ہاں دوہے

---

[1] ماہرینِ فن کے پاس قابلِ قبول نہیں ہے۔ تلسی داس نے بھی اپنے دور میں پہلے چرن میں ۱۲ ماترائیں اور دوسری چرن میں ۱۲/۱ ماتراؤں کا تجربہ کیا تھا۔

کی صنف نصیحت آمیز اور عبرت آموز حقائق و دقائق سے بھرپور رہی نہیں بلکہ دنیا والوں کو راہِ مستقیم پر گامزن کرنے کا ایک موثر ذریعہ بھی تھی۔

میرے نزدیک ایک اچھا دوہا وہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر نہ صرف لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتا ہے بلکہ گھر گھر، گلی گلی اور بازاروں میں بھی اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ''دوہے'' سطحی اقدار اور تیسرے درجے کے ادب کے آئینہ دار ہوتے ہیں بلکہ یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ یہ صنف عام فہم، سیدھی سادی زبان میں اور ہلکے پھلکے لفظوں میں اپنے اندر خاص اشاریت، رمزیت اور ایمائیت کے ساتھ ساتھ گہرائی اور گیرائی کی بھی حامل ہوتی ہے۔

جدید دور میں اس صنف کو بہت زیادہ برتنے والے شعراء میں ندا فاضلی، کرشن موہن، کرشن مرادی، آزاد گلاٹھی، اور تنہا تماپوری قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعراء نے قدیم روایات کے مطابق ''دوہے'' کو ہندی مزاج بخشا ہے۔ لیکن کڈپہ کے مشہور و معروف، قادر الکلام شاعر ساغر جیدی کے دوہوں کو پڑھنے کے بعد خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ موصوف نے اس صنفِ شاعری کو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے میں اپنی بھرپور خلاقانہ صلاحیتوں سے کام لیا ہے۔

محمد حسن عسکری نے جمیل الدین عالی کے دوہوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انہوں نے دوہوں میں مروجہ اردو میں ہندی کے دس پانچ مقبول الفاظ ملا کر ایک خاص زبان وضع کی ہے۔''

اسی طرح ساغر جیدی نے اپنے بیشتر دوہوں میں فارسی، عربی اور اردو کی لفظیات کا سہارا لے کر اس صنف کے خدوخال کو نمایاں ہی نہیں کیا بلکہ خوب صورت

الفاظ وتراکیب، استعارات اور تمثیلات سے ممزوج بھی کیا ہے ۔ ساغر کے اس مستحسن عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صنف یہ اگر توں (شورسینی اُپ بھرنش) کی نرم وسبک باہوں میں سانس لیتی ہوئی کئی زبانوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی اردو زبان سے اپنا ناتا جوڑ کر مقبولیت کی آفاقی سرحدوں سے جا ملی ہے۔

ساغر جیّدی کے دوہوں میں وہ تمام تر خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو "دوہے" کی امتیازی خصوصیات کی بھرپور عکاس ہوتی ہیں۔

اگر ساغر جیّدی کے دوہوں کا مطالعہ خالص ہندی کے درج ذیل شعراء کے دوہوں کے تناظر میں کیا جائے تو یہ بات ہمیں تسلیم کرنی پڑے گی کہ ساغر جیّدی نے "دوہے" کی صنف کو اردو شاعری کا رنگ وروپ ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس صنف کو سوندھی سوندھی خوشبوئیں بھی دی ہیں۔

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن مورو من پیو کو، دوؤ بھئے اک رنگ

—— امیر خسرو

جلتے اُوبھن ببلبہ جل ہی ماہی بلا ئے
تیسا یہ سنسار سب مولہی جائے سمائے

—— عبدالقدوس گنگوہی

کاگا کرنگ ڈھا ڈھولیا، سگلا کھائیا ماس
یہ دوئی نینا مت چھُوا، پیا دیکھن کی آس

بابا فرید گنج شکر

صابن ساجی سانکی، گھر گھر پریم ڈبوئے
حاجی ایسا دھوئیے، بہنر نہ میلا ہوئے

—— حاجی علی

رحمن پانی راکھیو بن پانی سب سون !
پانی گئے نہ اُوبھارے موتی، مانس، چوُن

عبدالرحیم خانخاناں

میرا مجھ میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے سو تور
تیرا تجھ کو سونپتے ، کیا لگتا ہے مور

—— کبیر داس

سبل سہایک سبل کو کوُ نبل سہائے
پون جگاوت آگ کو، دیپ ہی دیت بجھائے

ورند

کام کرود مد لوبھ کی جب لگی من میں کان
کہا مورکھ کیا پنڈتئی دوُ ایک سمان

—— تلسی داس

اپنے سنگ کے جان کے، جوبن روپتی پیروین
استنن من نین نتمبھ کو بڑ و اضافہ کین

—— بہاری

نیا گھاؤ ہے پریم کا، جو چمکے دن رات
ہونہار بروان کے، چکنے چکنے پات

فراق گورکھپوری

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن، ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اُڑ جائے

جمیل الدین عالی

من کی جوت سے تن کو اپنے کرے وہی اُجیارا
جیون کے آکاش پہ جس کا جگمگ جگمگ تارا

——————— نادم بلخی

جیون کے بازار سے، ہوا نہ کچھ بھی پہ راپت
ہم تو چلے سنسار سے، اپنا کھیل سماپت

——————— کرشن موہن

پنچھی، بالک، پھول پھل الگ الگ آکار
ماٹی کا گھر ایک ہی سارے رشتہ دار

——————— ندا فاضلی

کہہ دو لے جائیں کہیں، سپنے اپنا رُوپ
دیواروں کو پھاند کر، آنگن آئی دھوپ

——————— بھگوان داس اعجاز

کومل کومل مدھری، چتون پر مسکان
چنچل چنچل دلبری، ساجن کی پہچان

——————— کرشن مراری

جا کر بیٹھیں چار پل، کن پیڑوں کے پاس
ظفر ہمارے بھاگ میں شہروں کا بن باس

——————— ظفر گورکھپوری

ساغر جیّدی کے دوہوں میں ایک چونکا دینے والا خیال ملتا ہے۔ اور ان کے صاف ستھرے لہجے میں دل فریب کیفیت نظر آتی ہے جس پہ قاری سر دھنے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غزل سے لطف اندوزی تو ایک مُسلّم بات ہے مگر دوہوں میں

رنگِ تغزل کا سماں پیدا کرنا دوہا نویس کا ہی حصّہ ہے۔ اور یہ خصوصیت ساغر جیدی کے ہاں بھی نمایاں ہے۔ میں نے اُن کے دوہوں کے مطالعہ کے دوران یہ بات محسوس کی ہے اور یقین ہے کہ ان کا ہر قاری یہی محسوس کرے گا۔ ذیل کے دوہوں میں جو میں نے بغیر کسی انتخاب کے لیے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ "دوہے" غزل کے مطلعوں سے کتنے قریب اور مزاجاً ممیز بھی ہیں :

- تیرا فن تیرا ہنر، سب کچھ تیرا کمال
  ہم تو گونگی چیز ہیں، ہم سے کیسا سوال
- نام نہ تھا اپنا کوئی، نہیں تھی اپنی نمود
  ہمیں وجود میں لایا ہے، آپ کا صرف وجود
- ہیرا ہوں یا کانچ ہوں، کیسے ہو پہچان!
  کان ہی کان ہیں ہر طرف، ایک نہیں ہے زبان
- رشوت کے بازار میں، کیا شئے ہے اخلاق
  پانی کی ایک بوند سے، بھیگ گئے اوراق
- ہم نے چھپا کر رکھے تھے، طاق پہ میٹھے ظروف
  صبح قطار میں نکلے ہیں، چلتے پھرتے حروف
- ہنستے ہنستے کاٹیں گے، صدیوں کی ہر کاشت
  لیکن قوم کی بزدلی، کون کرے برداشت
- سینہ اپنا تان لو، کچھ نہ رہے منطوق
  پھول اُگلنے آئی ہے، دو نالی بندوق
- چونک اٹھے گی نیند سے، آج ہر اک شہراہ
  ملازموں کی جیب میں، بجتی ہے تنخواہ

بعض دوہوں میں ساغر جنیدی نے اپنے تخلّص کے استعمال سے غزل کے مقطعوں کا مزاج پیدا کیا ہے اور یہ حضرت امیر خسرو، کبیر داس، تلسی داس، عبد الرحیم خان خاناں وغیرہم کی ہی روایت کا ایک اعادہ ہے: ؎

- اے ساغر! پھول پھل سے، لدی ہوئی تھی شاخ
  اسی کی ہو کر رہ گئی، میری نظر گستاخ
- ساغر! ایسے بیٹھے ہیں، ہم اپنوں کے بیچ
  ایک کھلونا کانچ کا، دو بچوں کے بیچ
- ساغر! مجھ سے نہ پوچھئے میرا پتہ میرا نام
  ٹوٹے پھوٹے ظرف کے، ہوتے نہیں ہیں دام
- ساغر! ہم وہ قفل ہیں، جس کی نہیں ہے کلید
  دہر کے ٹیڑھے ہاتھوں میں، ہم نہیں ہوں کے پلید

ساغر جنیدی کے دوہوں کے مطالعہ سے بہ آسانی اندازہ ہوگا کہ ساغر جنیدی کہاں تک دادِ تحسین کے مستحق ہیں۔ میرے خیال میں اردو ادب میں موصوف کا یہ تجربہ ایک جنید مقام رکھتا ہے۔ اور اس مستحسن تجربہ کے ذریعہ ایک قدیم صنف پھر سے اردو کے راستے جوان بن کر ابھر رہی ہے۔ یہ اردو کا ہی اعجاز ہے کہ وہ ہر پرانے تجربے کو نئے چولے میں ڈھال کر اپنے اندر بڑی خوبی سے سمو لیتی ہے۔

میں ساغر جنیدی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے آنے والے دَور کو ایک نئی راہ اور ایک نئی روشنی سے روشناس کیا ہے۔ ٭٭

مطبوعہ "پندار" بہار



ڈاکٹر راہی قریشی اور "عکس کی ہیبت"

کلیم الدین احمد نے اردو غزل کو "نیم وحشی صنف" قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف ہنگامہ ہی برپا نہیں کیا تھا بلکہ منظم طور پر ایک محاذ بھی قائم کیا تھا کلیم الدین احمد کا مغرب زدہ ذہن شاید مغربی ادب کے علاوہ کسی بھی ادب کو قابلِ اعتماد اور درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اردو غزل کے سلسلے میں ایسے غیر مہذبانہ اور ناگوار کلمات سے کام لیا ہے ــــ کلیم الدین احمد کے اس بیان سے ہمارے ہاں کے چند ایک دعوے دارانِ ادب متفق بھی ہیں۔ اکثر و بیشتر ناقدین نے موصوف کے اس بیان کی بھرپور مخالفت بھی کی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک اردو غزل کو نیم وحشی صنف کہنا ایک عظیم ادبی جرم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اردو غزل نہ نیم وحشی ہے نہ نیم وحشی ماحول کی دین ہے۔ بلکہ یہ بڑی مقدّس، پاک اور صالح آب و ہوا کا عطیّہ ہے اور یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ذہن و دل کی کائنات کا روشن عکس جلوہ ریز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس آئینہ میں اپنے عکس کا نظّارہ کرنے والوں کے دل و دماغ اگر نیم وحشی ہیں تو انھیں اپنا

عکس نیم وحشی ہی نہیں نیم پاگل بھی نظر آئے گا۔

خوشی اس بات کی ہے کہ یہ صنفِ سخن شروع سے لے کر آج تک اتنی سخت جان ثابت ہوی ہے کہ اس نے ہر دور کے ظلم سہے، طنز و تضحیک کے ستم اٹھائے مگر اس کی ہئیت، مقبولیت، سالمیت، پھیلاؤ، اپچ اور دل پذیری میں نہ کہیں کوئی تغیّر پیدا ہوا نہ تبدیلی کے نمایاں آثار — یہ وہ خوش نصیب صنفِ سخن ہے کہ ہزارہا مخالفت کے باوجود اپنے روایاتی حسن، نئے نئے تجربات و عوامل اور زندگی کی بدلتی ہوی قدروں کے ساتھ ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ اور تا قیامت رہے گی۔

ڈاکٹر راہی قریشی ایسے ہی غزل گو شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے غزل کی عبادت گاہوں میں نہ صرف نمازیں پڑھیں بلکہ ان نمازوں کے پس منظر میں جو آئینہ صفت ذات پنہاں ہے اس کی نور آور کرنوں سے اپنے احساسات و جذبات کو معطّر و منوّر بھی کیا ہے۔

کرناٹک میں راہی قریشی کے علاوہ ضمیر عاقل شاہی، فضا کوثری، خمار قریشی، مظہر محی الدین، خالد سعید، شکیل مظہری، خلیل خاور اور انور مینائی نے اس صنفِ سخن کی پرورش اور مشاطگی میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

فی الحال میرے سامنے ڈاکٹر راہی قریشی کا شعری مجموعہ "عکس کی ہجرت" ہے جس کے مطالعہ سے قاری کے ذہن و دل پر مرتب ہونے والے نقوش کا ذمہ دار اُن کا ذات و کائنات کی حقیقتوں پر ایمان، انسانی عظمتوں کا اعتبار و ایقان، اور ناخواستہ و دل برداشتہ رویّوں اور رشتوں کے پھیکے پن کا سرسری اعلان ہے۔ اظہار و احساس کی زبان میں جہنمی تمازت نہیں بلکہ نیم سرد و گرم فضا سے گزرتی ہوی تند ہواؤں کا لمس ملتا ہے...... فکر و تجربہ سے دوچار ہوتی ہوی ان کی شعری تخلیقات ایک عجیب و غریب گداز سے قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ ان

کے ہاں روایت کی پاس داری اور صالح قدروں کی عطرفشاں یقیناً بہت زیادہ ہے اس کے ساتھ جدید لہجہ کا امتزاج ان کے فکر و جذبہ کو ایک جدا اور منفرد خانے میں جگہ بخشتا ہے۔ "عکس کی ہجرت" میں راہی قریشی نے "لِکُلِّ شَیْئٍ مَلَکُوْتٌ"۔ (ہر چیز کے لیے ایک غیر کثیف تمثیل ہے۔) کا بہت اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ میرے نزدیک شاعری بذاتِ خود ذاتی اور کائناتی تجربات کی ایک بہترین تمثیل ہے۔ قدیم اصطلاح میں جس بات کو مجاز کہا گیا وہی بات راہی قریشی کے پاس حقیقت کی تمثیل ہے۔

جن اشعار میں راہی نے "آئینہ" کا ذکر بارہا کیا ہے وہاں مجازی معنی سے زیادہ ایک حقیقت کی تمثیل ذہن میں ابھرتی ہے۔ ؎

- ہر مسئلے نے بانٹ لیا ہے مرا وجود! ... بکھرا ہوا ہوں "آئینہ خانے" میں چارسو
- دنیا سے میرا کوئی تعلق نہ رابطہ ... اس آئینے میں عکس نہیں میرے روبرو
- ہر شخص کے آگے ہے یہاں آئینہ راہی ... اب کون کسی کو صلۂ عرضِ ہنر دے
- منظر لہو، پیکر لہو، ہر عکس لہو ہے ... جو آئینے دکھلاتے ہیں دیکھا نہیں جاتا
- آئینہ جھوٹا ہے، چہرہ جھوٹا ... ہو گیا عکس کا رشتہ جھوٹا
- آئینہ بھی ہے عکس کی ہجرت سے سوگوار ... ہم کو بھی انتظار رہا ہے دیر سے
- مرے وجود میں روشن ہیں عیب و ہنر ... مرا وجود زمانے کا آئینہ ٹھہرا
- یہی ہنر ہے یہی اپنا عیب ہے راہی ... کثافتوں میں بھی شفاف آئینہ رکھنا

جس طرح راہی قریشی نے "آئینہ" کی تمثیل کو وسیع اور کشادہ سمتیں بخشی ہیں اسی طرح اپنی غزلیہ شاعری میں "چراغ" یا "شمع" کی تمثیل سے اپنی فکری پرواز کو کہکشانی فضاؤں تک اونچا اٹھانے کی بھرپور کوشش کی ہے: ؎

- اُجالا بخشنے والے! مجھے مکاں بھی دے — "چراغ" بن کے کسی دشت میں جلوں کب تک
- آنگن ہے انتظار کا صحرا بنا ہوا — دہلیز پہ "چراغ" سسکتا ہے دیر سے
- اس دشتِ انتظار میں بجھتی نہیں اُمید — روشن "چراغِ" دیدۂ بیدار اب بھی ہے
- رفتہ رفتہ ہوئے بے نور بصیرت کے "چراغ"

دل ہے روشن نہ کہیں دیدۂ بینا روشن

- بھٹکنا مقدر ہے اس رہ گزر میں — "چراغِ" کفِ پا نہ تیرا نہ میرا
- بجھنے والی تھی، بجھی اِک "شمع" کنجِ انتظار

ربط فرسودہ ہوا، وعدے پرانے ہو گئے

- دہلیز ظلمتوں کے قدم روکتی رہی

شب کا ستم، "چراغ" سے مغلوب ہو گیا

- قتل ہوتے رہے "چراغ" وہیں — لوگ جس راستے سے آئے گئے

"چراغ" اور "آئینہ" ان دونوں تمثیلات سے راہی قریشی 'روشنی' اور 'عکس' کے تصور کو اُبھار کر ایک اچھوتا مضمون مرتب کرنے میں پورے طور پر کامیاب و کامران ہوئے ہیں۔ خود انسان خالقِ حقیقی کی ایماء کا ایک مظہر ہے۔ وہ ذاتِ حقیقی کے نور کی ایک تمثیل ہے یا اُس کے علم و ارادہ کا ایک حسین و جمیل عکس .... جہاں تک راہی قریشی کے کلام کے مطالعہ سے راقم کے متاثر ہونے کا سوال ہے، میں انھیں مذکورہ احساسات سے گزرا ہوں اور بہت محظوظ بھی ہوا ہوں۔ مجھے راہی قریشی کی ان اصطلاحات اور مفاہیم سے لبریز شاعری بذاتِ خود اردو ادب پر بہت بڑا ادبی احسان لگتی ہے۔

جس طرح اقبال کے ہاں "شاہین" پرورش پایا ہے اُسی طرح راہی قریشی کے ہاں "آئینہ" اور "چراغ" کی دو اصطلاحیں متعدد نئے مفاہیم

کے عکس کے ساتھ رونما ہوئی ہیں۔

راہی قریشی اپنے معاصر شعراء میں یقیناً داد و تحسین کے مستحق ہیں جنھوں نے "آئینہ" اور "چراغ" کے "عکس و روشنی" سے اردو شاعری کو ایک نئی فضا اور نئے ماحول سے آشنا کیا ہے۔ حالاں کہ اس سے پہلے بھی اکثر و بیشتر قدیم و جدید شعراء نے "آئینہ" اور "چراغ" کی لفظیات کو اپنے کلام میں اپنے اپنے طور پر استعمال کیا ہے لیکن راہی قریشی نے ان دونوں لفظوں کو مجازی معانی کے مدار سے باہر نکال کر ایک سچائی اور حقیقت کی تمثیل کا حامل بنا دیا ہے یہ اردو ادب میں اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

"عکس کی ہجرت" کے انتساب میں "عکسین" کے نام گنوا کر راہی قریشی نے بڑی غیر ادبی جرأت کا اظہار کیا ہے اور پھر ایک فارسی شعر پیش کر کے اپنے دامانِ نگاہ کی تنگی اور گل ہائے حسن کی فراوانی کے اعلان کے ساتھ اپنی ناآسودہ گل چینی کا بھی اقرار کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی خاموش احساسات کو غزل جیسی صدا بخشنے والی راہی قریشی کی شخصیت اور ان کا فن آج کے اُبھرتے ہوئے شعراء کے لیے ایک طرف مشعلِ راہ ثابت ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کا شمار کہنہ مشق اور باشعور اکابرین کی صف میں کیا جائے گا۔

مطبوعہ روزنامہ "سالار" (ادبی ایڈیشن) بنگلور
1990ء



اکرام کاوش اور "آبِ زر"

اردو ادب کی تاریخ میں میسور ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ یہاں اردو زبان کی نشو و نما دیگر قدیم مراکز کے برخلاف جنگ و جدال اور ضرب و قتال کے دوش بدوش جاری رہی ہے۔ سلطنتِ خداداد کے قیام سے بہت پہلے یہاں دکنی اردو یعنی قدیم اردو کا چلن عام ہو گیا تھا اور اس کی ترقی و ترویج کی لگن پیدا ہو گئی تھی۔ چناں چہ عبدالمومن موؔمن[1] مہدوی چنیاپٹن نے (جنہیں ڈاکٹر عابد صفی نے اپنی تحقیقی مقالہ "ٹمل ناڈو میں اردو نثر کا ارتقاء" میں مدراس کا باشندہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔) 1036ھ م 1681ء میں "اسرارِ عشق" نامی ضخیم مثنوی دکنی اردو میں لکھی

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادبِ اردو جلد اول ص 133 میں عبدالمومن موؔمن کو موؔمن بیجاپوری لکھا ہے۔ مگر ان کے بیجاپوری ہونے کی کوئی سند نہیں دی ہے۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ آگے چل کر موصوف نے موؔمن کا وطن سیناپٹن بھی بتایا ہے۔ ص 368۔ حقیقتاً موؔمن مہدوی چن پٹن (ریاست کرناٹک) کے باشندے تھے۔ جو کبھی لسانی تقسیم سے پہلے ٹمل ناڈو قدیم (مدراس) میں شامل تھا۔

شروع کی جس کا اختتام 1093ھ میں ہوا۔ اسی طرح حضرت شاہ محمد صدر الدین ولدِ حضرت شاہ میراں ولی اللہ ملقب بہ منزوی الجبلین (مدفون باوا آدم پہاڑی، مضافاتِ وشارم، ضلع شمالی آرکاٹ، مدراس) نے "مراۃ الاسرار" نامی رسالہ 1123ھ میں اپنے فرزند محمد امیر الدین کے مطالعہ کے لیے تصنیف کیا تھا۔

عہدِ سلطنتِ خداداد میں میسور میں اردو کو کافی فروغ حاصل ہوا، شمالی ہند سے بھی اہلِ علم وفضل یہاں کی علمی قدردانی کے زیرِ اثر آنے لگے۔ جیسا کہ لالہ مہتاب رائے سبقت، نواب حیدر علی خان کے دور میں یہاں آکر آباد ہو گئے تھے، جو ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اور جنھوں نے 1191ھ میں اپنا کلام "شمع مجلس" کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ اسی طرح ٹیپو سلطان شہیدؒ کے میر منشی زین العابدین شوستری نے سلطان کے حکم پر 1783ء میں "فتح المجاہدین" تصنیف کی تھی اور سلطان کے درباری شاعر حسن علی عزّت نے حسب الحکم سلطانی شہیدؒ 1785ء میں "مفرح القلوب" دکنی زبان میں تصنیف کی تھی۔ ان کے علاوہ شہرۂ آفاق مورخ میر حسن علی کرمانی متخلص بہ حاکم ولدِ سید عبد القادر کرمانی 1221ھ میں "بحرِ فوائد" نامی قواعدِ فارسی پر مشتمل رسالہ دکنی زبان میں اور "تجنیس اللغات" نامی لغات بھی مرتب کی۔

عہدِ کرشنا راج وڈیر سوم (1799ء تا 1831ء) میں اردو زبان نہ صرف میسور میں زور و شور اور دھوم دھام سے پھلی پھولی بلکہ میسور کے اطراف و اکناف کے علاقوں میں بھی اس نے اپنی ہر دل عزیزی کے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ چناں چہ سید ابراہیم درگاہی (المتوفی 1855ء) اور حضرت میر حیات[1]

---

[1] آپ مدرسۂ لطیفیہ ویلور (شمالی آرکاٹ) کے فارغ التحصیل تھے۔

ابنِ میر یوسف حسین کولاری نے اپنی بیش بہا تصانیف[1] اور نواب محمد حسین سلطان نسیم میسوری (متوفی اپریل 1888ء م 1305ھ) سے عوام و خواص کے قلب و نظر میں اپنا خاص اور نمایاں مقام بنالیا تھا۔ غلام حید ر سرور میسوری (مصنفِ "ششش لطائف" محررہ 1236ھ) اور عبدالحق (مصنفِ "چھوٹی کرسی") بھی اسی دور کے یادگار مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔

عہدِ انگریزیہ (1831ء۔ 1881ء) کے دوران میسور میں اردو کی رفتار اور بھی تیز تر ہوی۔ چناں چہ سید اسحاق سالم، غلام عابد (ولادت 1221ھ) ابوالحسن ناظر (ولادت 1811ء) حضرت سید شاہ شہاب الدین شہاب (متوفی 1905ء) وغیرہم اس دور کے یادگار اور میسور کی ادبی تاریخ کے زندہ اور روشن کردار ہیں۔

چامراج وڈیر کے زمانے میں اردو کی ترقی تیز تر نہ سہی اطمینان بخش ضرور رہی ہے۔ چناں چہ منشی سید عبدالحیٔ سبزواری (1334ھ) حضرت سید شاہ فقیر محی الدین قادری مقبل میسوری (متوفی 1346ھ) منشی غلام محمود صفی (متوفی 1916ء) مولانا عبدالخالق عرف اہبر (متوفی 1916ء) حضرت مولانا سرقاضی درویش پیران قادری (متوفی 1923ء) محمد قاسم انصاری قسیم میسوری ظہیر عاقل شاہی (متوفی 1961ء) اور حضرت ضمیر عاقل شاہی[2] اور غوث احمد علی خان افسر (متوفی ــــء) نے شہرِ میسور کی اردو روایت کے امین اور زبانِ اردو کے بہی خواہ، مخلص خادم و جانثار تھے۔

---

[1] "مصباح الحیات"، "خمسۂ حیات"، "شمع حیات"، "شمع محفل"۔

[2] مصنفِ "لالۂ صحرا" اور "اُجالوں کا سفر"۔

عہد حاضر میں بھی شہرِ میسور میں اردو زبان خوب ترقی پذیر ہے۔ یہاں کے ادباء و شعراء کی کثرت اور اس گلشنِ علم میں اہل فضل و کمال کی آمد و رفت نے یہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں زینہ بہ زینہ، منزل بہ منزل اضافہ کیا ہے اور یہاں کے ادبی ادارے مثلاً "بزمِ اردو"، "بزمِ اقبال"، "انجمنِ اتحاد المسلمین" اور "محبوبیہ مکان" کے مشاعروں نے اردو کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔

اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے سلسلہ کی ایک نہایت اہم کڑی جناب اکرام کاوش مؤلفِ "داستانِ میسور" اور مصنفِ "حرفِ زرّیں" ہیں جن کے اندر کا فن کار بہت توانا، حوصلہ مند، فراخ دل اور روشن نظر بھی ہے۔

اکرام کاوش کا شمار کرناٹک کے اُن شعراء میں ہوتا ہے جن کی شاعری روایات کی صالح قدروں کی پاس داری اور نئے ادراک و احساسات کی بُوقلمونی سے جلوہ ریز ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کی شاعری قاری کو چاہے وہ غزل ہو یا نظم الفاظ کی جادوگری، کرتب بازی اور علائم کے دلدل میں ڈبوتی ہے اور نہ احساس و جذبے کی ناآسودگی کے بھنور کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔

اکرام کاوش نے اردو شاعری کی مختلف اصناف کو درد، کسک، خوشی و انبساط، رنج و الم اور نئے تجربات کی روشنی سے ہم کنار ہی نہیں کیا بلکہ اپنے کرب و احساس کے اظہار کے لیے بڑی عام فہم، سیدھی سادی زبان کا سہارا بھی لیا ہے۔ ان کے ہاں فکری بیکرانی، کشادگی، رمزیت اور وسعتِ ایمائیت کی تلاش بے سود ہے مگر ان کے جذبات و احساسات سے جو لطیف پیکر ابھرتے ہیں وہ ان کے ماضی اور حال کے مدار میں اُچھلتے کودتے، چلتے پھرتے، ہنستے کھیلتے اور گنگناتے ہوئے مناظر پیش کرتے ہیں۔ جن کا پس منظر ذہن و دل پہ ایک گہرا تاثر نقش کرتا ہے.... سچ تو یہ ہے کہ ان کا زیرِ نظر مجموعہ "آبِ زر" کی

ہر نظم میں ان کی اپنی ذات مختلف پہلوؤں اور مختلف سمتوں میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ ان کی بعض نظمیں مثلاً "تو کہاں ہے" ، "کہاں تک چلو گے" ، "نیا رشتہ" اور "نظّارہ" مختصر ترین، جامع اور خوب صورت احساس و جذبے کی آئینہ دار ہے

کہاں تک چلو گے

کہاں تک
تم میرے ساتھ چلو گے
میں ہوں اک صحرا نورد
میرے قدموں تلے
سارا عالم سانس لے رہا ہے

نیا رشتہ

چلتے پھرتے جسموں کا رشتہ
سانسوں تک محدود
قبر سے آگے
کون کس کا ہے ؟
کس کو خبر

نظّارہ

سیاہی پھیل کر
روشنی کے وجود میں ضم ہو گئی
اور ہم چُپ چاپ
بلندیوں کی آنکھوں سے دیکھتے رہ گئے

نفسِ امّارہ

اک مدّت سے
وہ وحشی
میرے اندر بند تھا
پھر سے وہ
زنداں سے باہر آ گیا ہے
تاکہ ہر اک گام پہ
حسرتوں کے تازیانے سے
مری خاطر کرے
تاکہ پھر
صبر کے رستے پہ
میری بدنامی میں
کچھ کسر باقی نہ رہے

کالی مسرت سے گریز

کہیں لمحاتی خوشی کی خاطر
صدیوں کی آسودگی سے

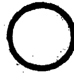
ناطہ توڑ لیا جاتا ہے
تم ہی انصاف کرو آخر
وہ دل جس میں بے پناہ محبت ہے
وہ نظر جس میں اُفق تاب روشنی ہے
وہ گفتگو جو خطرِ راہِ فکروفن ہے
وہ ساتھ جو بہاروں کا نعم البدل ہے
وہ تحریر جس سے روح بالیدہ ہے دماغ روشن ہے
ان سب کا کیا ہو گا
کیا مصلحت صداقت کی جگہ لے سکے گی
اُن دِنوں کو تم کیسے بُھلا سکو گے
جن دنوں کچھ لوگ گروہ میں بٹ گئے تھے حملہ آور ہوئے تھے
یہ رات رات ہے اے دوست
تم بغور دیکھو اس شبِ تیرہ و تار کو
میرے ولولے میرے جذبے میرے جنون کو تو دیکھو
خدا کے لیے بغور دیکھو میرے دامنِ تار تار کو
تم عدل کی ڈور اپنے ہاتھ میں لے لو
اور گریز کرو
اُس کالی مسرّت سے

تو کہاں ہے؟

میرے معبود
تیرے دربار میں
محوِ سجدہ ہے ادراک
اور ادراک کی وسعتیں
مگر
تُو کہاں ہے......

خوشی اس بات کی ہے کہ پیشِ نظر مجموعہ "آبِ زر" میں کرناٹک کے نام نہاد شعرا کی نظموں کی طرح اکرام کاوش کی نظموں میں اپنے "ہم عصروں کی بازگشت کہیں بھی سنائی نہیں دیتی"۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسی روش سے اکرام کاوش کا ذہنی سفر جاری رہے گا تو مستقبلِ قریب میں وہ اپنی الگ پہچان اور شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

مطبوعہ "آبِ زر" ۱۹۹۲ء



عبدالقادر ادیب... بحیثیت انشائیہ نگار

ایک زمانہ تھا کہ اردو ادب میں انشائیہ نگاروں کی بہتات تھی، پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ صنفِ انشائیہ کے فن کاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی لیکن 1960ء کے بعد اس صنف کے بہی خواہوں اور اپنانے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصاً 1961ء اور 1966ء میں جب ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے مجموعے "خیال پارہ" اور "چوری سے یاری" منظرِ عام پر آئے تو پاکستانی اردو ادب میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوا اور پاکستان کے کئی باشعور فن کاروں نے اس صنف کی طرف خاص توجہ دیتے ہوئے اس صنف میں اپنے نت نئے احساسات، تجربات اور مشاہدات کے جوہر دکھائے جن فن کاروں نے اس صنف کو نئی زندگی اور نئی توانائی بخشی ان میں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل آذر، شہزاد منظر، حیدر قریشی، غلام جیلانی اصغر، حامد برگی اور سلیم آغا قزلباش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مندرجۂ بالا

انشائیہ نگاروں کی فہرست میں معدودے چند انشائیہ نگاروں نے اس صنف کو بہت اونچا ہی نہیں اٹھایا بلکہ اسے ان ارتقائی بلندیوں تک پہنچایا ہے جہاں فکر و احساس کی وسعتوں کا نور اور دل و نگاہ کے آفاقی رشتے استوار ہیں۔

1966ء کے بعد پاکستانی ادبی ماحول میں اس صنف کے کئی مجموعے منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر انور سدید کا مجموعہ "ذکر اس پری وش کا" اور جمیل آذر کا مجموعہ "شاخِ زیتون" واقعی اس صنف کی مقبولیت، نئی کشادگی، گہرائی و گیرائی اور نئی تجلیاتی شعور کے ضامن ہیں۔

ہندوستان میں اس صنف کو اپنانے والوں کی تعداد مختصر سہی لیکن جن فن کاروں نے اس صنف کو سنجیدگی کے ساتھ اپنایا اور سلیقہ سے برتا ہے ان میں (دورِ قدیم میں) وحیدالدین سلیم پانی پتی، خواجہ حسن نظامی، پریم چند پطرس بخاری، مرزا فرحت اللہ بیگ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جن کے انشائیے زندگی اور سماج کے رشتے، حیات و کائنات کے رابطے، صالح روایاتی اقدار، ادبی کلاسیکی وقار کی بھرپور چاشنی لیے انشائیے کی صنف میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور دورِ جدید میں کنہیا لال کپور، احمد جمال پاشا، زینت ساجدہ اور کرناٹک کے عبدالقادر ادیب کے انشائیے ایک نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

عبدالقادر ادیب شہرِ بنگلور کے کہنہ مشق شاعر اور سلجھے ہوئے انشائیہ نگار اور پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں۔ انہیں مقدمات کی پیروی کے سلسلے میں مختلف لوگوں کی افتادِ طبع، جذبات اور نفسیات کا ژرف نگاہی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ زندگی کے گہرے تجربات کی دھیمی آنچ سے احساس کا آنچل آہستہ آہستہ سلگنے لگتا ہے تو تخلیق کی فضـ

میں مختلف رنگوں کی پھوٹ سے قوسِ قزح کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ قوسِ قزح کی یہ ست رنگی کیفیت خود عبدالقادر ادیب کی زندگی بھی ہے۔ ان کی سدابہار شخصیت چنبیلی کی چھاؤں تلے سانس لیتی ہوئی کائنات کی طرح ہمیشہ خوش بو بکھیرتی رہتی ہے۔ لیکن ان کے انشائیوں میں زندگی کا کرب، احساس کی اذیت محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے نگار خانۂ حیات کی لذت کو محسوس کیا ہے، زندگی کی اذیت کو، کرب اور درد کو قریب سے پہچانا ہے۔

ان کے انشائیوں کے تجزیاتی مطالعے نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کیا ہے کہ اُن کی ہنستی، مسکراتی اور پھول برساتی شخصیت کے پس منظر میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں، آہوں اور فریادوں کا سیلاب حصار توڑنے کی کشاکش میں کارفرما ہے۔ لیکن اس بلند حوصلہ فن کار نے دامانِ ضبط کو بڑی مضبوطی اور سنجیدگی سے تھاما ہے۔ ان کے شفاف ماتھے پر شکنوں کے جال نہیں بچھے ہیں ان کی آنکھوں میں اداسی اور غم کے سائے نہیں منڈلاتے ہیں۔ ان کے خط و خال سے غم کی اذیت ناکی مترشح نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ہنستے رہتے ہیں، مسکراتے رہتے ہیں۔ ان کے وجود کے مختلف دریچوں سے روشنی کی کرنیں چھنتی ہیں لیکن ہو سکتا ہے انہوں نے اپنے انشائیوں میں جس درد کو الفاظ کا پیرہن بخشا ہے وہ درد ان کی تنہائی میں امڈے ہوئے آنسوؤں کو اپنے نادیدہ دامن میں جذب کر لے۔

عبدالقادر ادیب کا جمالیاتی احساس نہایت توانا اور صحت مند ہے ان کے 'ذوقِ جمال' نے رہ گزرِ شوق کو بھی اتنا اونچا اٹھایا ہے کہ ان کی رہ گزرِ شوق میں قدم قدم پر کہکشاں کی بساط بچھ جائے۔ بے پناہ مصروفیات کے عالم میں لمحات کی انگلی تھامے وہ ایسے انجان راستوں کا سفر اختیار کرتے ہیں کہ انھیں راہ کے نشیب و فراز کی فکر ہوتی ہے نہ منزل کی تلاش۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ

وہ منزل سے بے خبر ہیں لیکن وہ منزل کی جستجو میں ہیجانی کیفیت کا شکار نہیں ہوتے ۔ ویسے اُن سے پہلی ملاقات میں اس کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ فن کار جو ایڈوکیٹ بھی ہے ، مہذب و شائستہ بھی ہے ، باغ و بہار شخصیت کا مالک بھی ہے ، کسی بوکھلاہٹ کا شکار ہے ۔ لیکن یہ لمحاتی تاثر دیر تک قائم نہیں رہتا ۔ مسلسل ملاقاتوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ عبدالقادر ادیب کی کشش انگیز شخصیت چاہے جانے کے قابل ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ نظریہ غلط ہو ، لیکن جو کچھ محسوس کیا ہے اس کے اظہار میں اغماض سے کام نہیں لیا ہے ۔ عبدالقادر ادیب کی صحت مند تخلیقات میں ابھی تجریدی آرٹ کے منظر نظر نہیں آتے چوں کہ شاید ان کی افتادِ طبع کا تقاضا یہی ہے کہ علائم کی بھول بھلیوں میں قاری کے ذہنی انتشار کی لَو کو بڑھانے کی بجائے مافی الضمیر واضح طور پر ظاہر کر دیا جائے ۔ آج کل جس طرح جدید شاعری نے اپنے سانچے بدلے ہیں ، ابلاغِ خیال کے سلسلے میں جو نئے اسالیب سامنے آئے ہیں کرناٹک کے بعض فن کاروں نے بھی انہیں اسلوب کو اپنایا ہے ۔ جن میں محمود ایاز ، راز امتیاز ، حمید الماس خلیل مامون ، فضا کوثری ، قابلِ ذکر ہیں ۔ یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ انہوں نے تجریدی آرٹ کے صحیح مصرف کو سمجھا ہے ، پرکھا ہے اور رچا یا ہے ۔

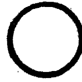
عبدالقادر ادیب کے یہاں تجریدی آرٹ کے عناصر کا فقدان ہے لیکن روایات کے صالح اور روشن عناصر ان کی تخلیقات میں اس طرح سما گئے ہیں کہ گویا یہ ناخن کا قرض بڑے خلوص ، رچاؤ اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کر رہے ہیں ۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ آج کرناٹک کے فن کاروں میں تخلیق عمل اپنی بھرپور شدت اور توانائی کے ساتھ کارفرما ہے ۔ خصوصاً جدید ترین نسل

میں سلیمان خمار، تشکیل منظری، راہی قریشی، خمار قریشی، فیاض قریشی، خلیل خاور خالد سعید، رزاق افسر، اکرام کاوش، الف احمد برق، جبار جمیل، منیر احمد جامی سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جدید ترین نسل کا قافلہ اپنے فن کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنی تہہ دار شخصیت کے ساتھ بھرپور انصاف کرے گا۔ ●●

مطبوعہ" سالار" بنگلور۔ ادبی ایڈیشن

1982ء



یعقوب اسلم کی افسانہ نگاری

تامل ناڈو کی سرزمین پر بہت کم شاعر ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کے اندر شعری حسّیت کی ست رنگ چھوٹ کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی صلاحیتوں (بالخصوص افسانہ نویسی) کی آفاق گیر وسعتیں بھی موجود ہیں۔ تامل ناڈو میں اردو افسانہ نگاری کی عمر مختصر ہی سہی، لیکن جن افسانہ نگاروں نے اس صنف کو نئی جہت سے آشنا کرنے اور متنوع پہلوؤں سے معمور کرنے میں اپنی بہترین اور گراں قدر صلاحیتیں صرف کی ہیں ان ادیب بھارتی، راز امتیاز، رشید مدراسی، انور ربّانی، سہیل عرفان، حسن فیاض، انور کمال، شبیب احمد کاف اور راقم الحروف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے مطالعہ کے بعد یہ بات بآسانی محسوس ہونے لگتی ہے کہ ان کے افسانوی جذبات کی مہک شعری دریچوں سے در آئی ہے اور اس ہوائیں جہاں نئے اور پرانے موسموں کی بھینی بھینی خوشبو

موجود ہے وہیں درد کی میٹھی میٹھی کسک بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔

راجیندر سنگھ بیدی کہتے ہیں کہ کہانی اور افسانہ ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت اور عرق ریزی سے ہاتھ آتا ہے۔ اور یہ فن رفتہ رفتہ پڑھنے والے کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور انسانی احساس بن کر جسم کے تمام اعضا میں گھل مل جاتا ہے۔

تامل ناڈو میں راز امتیاز کے افسانے بیدی کے بیان کی بھرپور آئینہ داری کرتے ہیں۔ جہاں تک میرے مطالعہ اور سمجھ کی دوڑ کا تعلق ہے میں تو یہی کہوں گا کہ راز امتیاز نے اگرچہ شاعری کے مقابلہ میں افسانے بہت کم لکھے ہیں لیکن انہوں نے جو بھی لکھا ہے ان میں زندگی کی توانا قدروں کو اور ان کے اطراف و اکناف مچلتی چہکتی مسکراتی اور سسکتی ہوی صداقتوں اور ان صداقتوں کی کوکھ سے جنم لینے والی بے شمار تلخیوں کو بڑے تیکھے انداز میں اجاگر کرتے ہوئے افسانے کی صنف کی حدوں کو آسمانِ فن کی لازوال قدروں تک پہنچایا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ تامل ناڈو کے مذموم، مہلک اور اردو دشمن ماحول نے کبھی اس فن کار کی ہمہ جہت ادبی صلاحیتوں تبحّر علمی اور ژرف نگاہی کی قدر نہیں کی۔

تامل ناڈو میں افسانہ نگاری کی ایک اور کھیپ ایسی بھی موجود ہے جس کا رشتہ روایت پرستی سے بہت گہرا اور بڑا ہی مضبوط ہے اور جن کی تحریروں کا ناطہ ہنوز اس سرحد کو چھو نہ سکا جس کا رشتہ نت نئے سوچوں کی آفاقی وسعتوں سے جا ملتا ہے۔ یعقوب اسلم بھی انہیں افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں لیکن ان کے افسانوں میں کہیں کہیں روشن امکانات کی خوش آیند لکیروں کا احساس بھی اجاگر ہوتا ہے۔ ان کے افسانے روایتی

ہوتے ہوئے بھی تدقیق کے عمل اور بھرپور فکری اُپچ سے قریب ہیں۔

یعقوب آسلم کے بعض افسانے مثلاً "مزاجِ گرامی"، "مجھے سکون چاہیئے"، اور "انٹرویو" صنفِ انشائیہ کی سوندھی سوندھی مہک اور اس کے روشن دائرے کے اندر جنم لینے والی چمک دمک سے درخشندہ نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے لفظوں میں انشائیہ اردو ادب کی ایک ایسی صنفِ اظہار ہے جس کے مختلف ٹکڑے بے ترتیب صورت میں متعدد قدیم اور جدید نثر نگاروں کے مضامین میں بکھرے پڑے ہیں۔ اور یعقوب آسلم نے انہیں منتشر اور پراگندہ ٹکڑوں کو یکجا کر کے انھیں اس موجودہ دَور کی کشمکش اور پراگندگی، زبوں حالی اور کشاکش سے ممزوج کرنے کے بعد ایک نئی کیفیت سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جہاں تک ان کے افسانوں کے پلاٹ اور تھیم (Theme) کا تعلق ہے یہ روزمرّہ کی زندگی اور اس کے اردگرد سانس لینے والے ہلکے پھلکے واقعات پر مشتمل ہے۔ آج کا انسان جو ایک کلرک بھی ہے اور ایک گھریلو فرد بھی، ایک ذمہ دار باپ بھی ہے اور ایک محبت کرنے والا شوہر بھی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس قدر عظیم الشان ترقی اور صنعتی دور کی فراہم کردہ بے شمار سہولتوں کے باوجود زندگی کی قدیم ترین پامال اور بوسیدہ قدروں سے اپنا دامن نہیں بچا سکا ہے۔

یعقوب آسلم نے اپنے افسانوں میں ایسی ہی لازوال قدروں کی منظر کشی کی ہے اور بتایا ہے کہ ایسے ہزاروں صنعتی انقلابات اور سائنسی ترقیاں مل کر بھی زندگی کی ابدی اور بنیادی ضرورتوں کا کوئی خاطر خواہ حل نہیں

پیش کر سکتیں ۔ روزِ ازل ہی سے آدمی ان کا محتاج رہا ہے اور تا ابد رہے گا ۔ چناں چہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :۔

"مگر ہم سوچتے ہیں تو ہمیں بڑا تعجب ہوتا ہے
کہ کیا یہی آپ کی دعا ہے کہ ہماری قمیص پر اس
وقت دنیا بھر کے بر اعظموں کے نقشے بنے ہوئے
ہیں۔ زندگی کی انتہائی ضروری اشیاء کی قیمتیں آسمانوں
پر کمندیں پھینک رہی ہیں ۔ تین مہینوں سے بچوں
کے اسکول اور کالج کی فیس جمع نہ ہو سکی ۔ بیگم
صاحبہ کئی مہینوں سے ایک ساڑی کے لیے اصرار کرتے
کرتے چپ سادھ چکی ہیں اور اس وقت ہمارے
سامنے ایک سب سے بڑا اور بین الاقوامی مسئلہ
یہ آکھڑا ہے کہ اس وقت دفتر کو کون سی قمیص
پہن کر جائیں تاکہ سفید پوشوں کے زمرے میں
ہمارا شمار ہو سکے ۔" "مزاج گرامی"

ایک معمولی سی بات ہے اور نہایت سیدھے سادے الفاظ میں پیش کی گئی ہے لیکن موجودہ ماحول میں سانس لینے والے ایک عام کلرک کی زندگی کتنی واضح اور صاف دکھائی دیتی ہے ۔

یعقوب اسلم کے افسانوں میں بے ساختہ پن ہے اور یہ بے ساختہ پن کسی تکلف یا آورد کا نتیجہ نہیں بلکہ زندگی کی سچائیوں اور تلخیوں کے گہرے مطالعہ کا آئینہ دار ہے ۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہی نہیں بلکہ جس انداز سے دیکھا ہے اسی انداز سے پیش کرنے کی سعی بھی کی ہے ہو سکتا

ہے کہ ان کے کسی نقطۂ نظر سے کسی کو اختلاف ہو۔ لیکن نقطۂ نظر کا یہ اختلاف زندگی اور اس کی تلخ صداقتوں کو جھٹلا نہیں سکتا۔ ان کا افسانہ "آنچل کے پھول" اس کی بہترین مثال ہے۔

یعقوب آسلم نے انسانی نفسیات کا بھی نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ انسانی ذہن میں کئی قسم کے (Complexes) پیدا ہوتے ہیں جنھیں کبھی بھوت پریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کبھی جادو ٹونے سے آج ہندوستان کے متوسط طبقے کے بے شمار گھرانے ایسے (Complexes) کا شکار ہیں۔ جہالت اور کم علمی کا یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا بہت دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یعقوب آسلم نے اپنے افسانے "چہروں کی دیوار" میں ایسی ہی ایک الجھن کو بڑی فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کا ایک اور افسانہ "دراڑ" بھی کچھ ایسے ہی موضوع کو پیش کرتا ہے۔

یعقوب آسلم کو زبان اور طرزِ بیان دونوں پر بڑی فن کارانہ قدرت حاصل ہے۔ وہ ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان نہایت صاف شیریں، شگفتہ اور رواں ہے۔ صفحات کے صفحات پڑھتے چلے جائیے لیکن نہ کہیں عبارت میں کسی قسم کا جھول نظر آئے گا اور نہ کہیں علمیت کا اظہار۔ ثقیل اور نامانوس الفاظ کی بھول بھلیاں ان کے یہاں مفقود ہیں۔ اکثر چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے پتے کی باتیں نہایت آسانی اور روانی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد قاری کو الفاظ کی بھول بھلیوں اور علائم کی تاریک و ناآشنا گلیوں میں بھٹکنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

فکر کی بلندی اور جستجو کا پھیلاؤ، ہر اچھے اور بڑے فن کار کو کائنات کے اُن ان گنت اور انجانے رموز سے آشنا کر دیتا ہے جن کے اظہار سے فن کار کی لاشعوری تہیں روشن سے روشن تر نظر آنے لگتی ہیں۔ اور فن کار اس روشنی میں اپنا ایک الگ چہرہ اور اپنی ایک خاص پہچان متعین کر لیتا ہے۔ یعقوب اسلم کے یہاں فکر اور جستجو کی لو آہستہ آہستہ فن کی بلندیوں کی طرف اپنے قدم اٹھاتی دکھائی دیتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنی منزل تک بآسانی پہنچ کر اردو کے افسانوی ادب میں اپنے تابندۂ لازوال اور غیر فانی نقوش چھوڑ جائیں گے۔ ••

مطبوعہ ”چہروں کی دیوار“ 1986ء